www.urducouncil.nic.in

اپریل 2018 قیمت:-/10₹

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
اردو دنیا
نئی دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ:15 روپے، سالانہ:150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی
فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیش کش

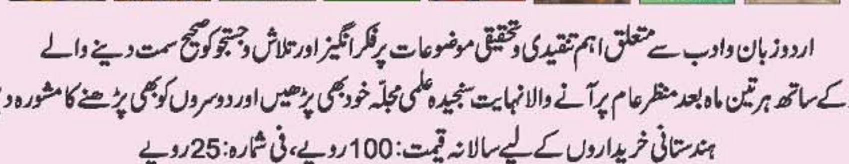

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون:26109746، فیکس:26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

بچوں کی دنیا

جلد: 6 شمارہ: 04 اپریل 2018

مدیر: پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل۔ محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،

جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000

شعبہ ادارت: 49539009-11

ای میل

bachonkiduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /10 روپے، سالانہ /100 روپے

▪ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت

ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم

نئی دہلی-110066

فون: 26109746

ای میل: sales@ncpul.in

ncpulsaleunit@gmail.com

علاقائی مرکز: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 040-24415194

اس شمارے میں

مدیر کا خط	آپس کی باتیں		04
بڑوں کی باتیں	ڈاک خانہ		05
مضامین	کلینڈر کی کہانی	عظیم اقبال	06
	2017 کے ہونہار بچے	محمد اعجاز	08
نظمیں	گرمیاں آگئیں	جگن ناتھ آزاد	12
	بلی آئی	ذکیہ مشہدی	13
	مچھر	تنویر پھول	14
	پریشانی سے بچو	وکیل نجیب	14
مضامین	رفیع احمد قدوائی	ایرا سکینہ	15
	امتحان کی تیاری کیسے کریں؟	مومن فیاض احمد غلام مصطفیٰ	20
نظمیں	آسماں	جاوید عبدالعزیز	24
	ہم تمھیں مان لیں گے	شاد اعظمی ندوی	24
کہانیاں	بڑی دل کی بچی	اسد رضا	25
	گم شدہ گڑیا	افتخار انیس حمیدی	28
	رؤف بازیگر	محمد ارشد خان	31
	اردو زباں ہماری	سحر اسعد	35
نظم	علم کا بین	اطہر عبداللہ سوداگر ٹانڈوی	37
باتصویر کہانی	طوطا کہانی	محسن خان	38
قسط وار ناول	زمین کی تہہ میں	شکیل صدیقی	43
کہکشاں	کتاب میلہ	شیخ محمد یسع آصف اقبال	51
	اچھے ماحول کی برکتیں	جرار احمد	52
	پہیلیاں	جاوید اقبال	53
	لومڑی اور جنگلی بطخ	ایم یوسف انصاری	54
	سرسید احمد خاں	شاکر حسین شبیر حسین	55
	سائنسی معلومات	سید مرتضیٰ سید خالق	55
	چمن چمن کے پھول		56
ننھے فنکار	سونے کا ہرن	ہادیہ نور	58
	بچوں کی پینٹنگ		60
آپ کی باتیں	اردو فیس بک		62

آپس کی باتیں

پیارے دوستو! اپریل کا مہینہ آپ سب کے لیے ڈھیر ساری خوشیوں کی سوغات لے کر آتا ہے۔ آپ میں سے بہت سوں کے امتحانات ہو چکے ہوں گے اور کچھ کے ہو رہے ہوں گے۔ ایک طرف امتحانات کے ختم ہونے کی خوشی ہوتی ہے تو دوسری طرف امتحانات کے بعد کی چھٹیوں کی۔ اپریل ایسا مہینہ ہے جب گرمیوں کی آمد آمد ہوتی ہے۔ اِس موسم میں کھیتوں کھلیانوں میں ہر طرف سبزہ نظر آتا ہے اور اِس موسم کو موسم بہار بھی کہا جاتا ہے۔ پیڑوں پر نئے پتے آتے ہیں، پھول کھلتے ہیں، پہاڑوں پر برف پگھلنے لگتی ہے۔ غرض ایک خوبصورت منظر ہوتا ہے۔ موسم سے الگ ہٹ کر بات کریں تو اپریل میں گرو نانک، گرو تیغ بہادر، کستوربا گاندھی، رانا سانگا، بھیم راؤ امبیڈکر، دادا صاحب پھالکے، تینزنگ نورگے، بڑے غلام علی خاں، شمشاد بیگم، مولوی ذکاء اللہ، آغا حشر کاشمیری، جگر مرادآبادی، احتشام حسین جیسی عظیم ادبی، سماجی و سیاسی شخصیات کی پیدائش کا بھی مہینہ ہے۔ اپریل اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اس ماہ کی 7 تاریخ کو عالمی یوم صحت منایا جاتا ہے۔ ڈبلیو ایچ او کی عالمی صحت اسمبلی نے 1948 میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ 7 اپریل کو ساری دنیا میں عالمی یوم صحت کا انعقاد کیا جائے اور لوگوں میں صحت کے تئیں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ ہر سال اِس دن کو الگ الگ موضوع سے منسوب کیا جاتا ہے۔ 2016 میں شوگر کے تئیں بیداری پیدا کرنے کے متعلق پروگرام کیے گئے جبکہ 2017 میں تناؤ کے خاتمے پر مذاکرے منعقد کیے گئے جبکہ اِس سال اس کا موضوع عالمی صحت کوریج ہے۔

عالمی یوم صحت منانے کا مقصد ہے کہ لوگ صحت کے تئیں بیدار ہوں۔ اپنی صحت کا خیال رکھیں کیونکہ تندرستی ہزار نعمت ہے۔ لیکن ہم اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے۔ آپ سب بھی نہ صرف اس دن بلکہ پورے سال اپنی صحت کا خیال رکھیں۔ آپ جانتے ہیں ساری دنیا میں شوگر، ٹی بی، کینسر، گردے وغیرہ کے امراض میں اضافہ ہو رہا ہے اور لاکھوں لوگ ان بیماریوں سے اپنی جان گنوا رہے ہیں۔ ان بیماریوں کی بہت ساری وجوہات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہم نے اپنی زندگی کو آرام پسند بنا لیا ہے۔ ہم پیدل کم چلتے ہیں، ورزش نہیں کرتے، موبائل اور دیگر مشینوں کا زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ آپ بھی اگر اسمارٹ فون استعمال کرتے ہیں تو اِس بات کا دھیان رکھیں کہ رات میں دیر تک موبائل فون نہ استعمال کریں، رات کو دیر تک جاگ کر نیند خراب نہ کریں۔ صبح جلدی اٹھ جائیں۔ فاسٹ فوڈ کم کھائیں۔ خراب اور باسی کھانے نہ کھائیں۔ صاف صفائی کا پورا دھیان رکھیں۔ اگر آپ کے والدین آپ کی بھلائی کے لیے کچھ کہہ رہے ہیں تو اس کو سنیں اور اس پر عمل کریں۔ اپنے آس پاس کے لوگوں میں صحت کے تعلق سے باتیں کریں کیونکہ آپ کی ان کوششوں سے اگر لوگوں کو فائدہ ہوتا ہے تو یقیناً یہ ایک بڑا کارِ خیر ہوگا۔

اب آپ 'بچوں کی دنیا' پڑھیں اور اپنے تاثرات ضرور بھیجیں۔ بچوں کی دنیا آپ کا رسالہ ہے اور اسے آپ کی پسند کے مطابق سجانا ہماری ذمے داری ہے۔ اِس ماہ ہم نے باتصویر کہانی کی نئی سیریز کا آغاز کیا ہے۔ امید ہے کہ آپ کو یہ شمارہ پسند آئے گا۔

آپ کا

ارتضیٰ

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

ڈاک خانہ

'بچوں کی دنیا' جنوری کا شمارہ دستیاب ہوا۔26 جنوری سے متعلق مضامین اور نظمیں بہت عمدہ اور معلوماتی ہیں۔ جبکہ اس کے پہلو بہ پہلو بعض نظمیں بحر سے خارج ہیں۔ دسمبر کے شمارے میں جنوری کا شمارہ آجانے کی وجہ سے جنوری کے جشن جمہوریت کا پروگرام کرنے میں مدد مل جاتی ہے۔ صفحات میں اضافہ کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔

محمد عبدالوہاب معروفی، مئو، اترپردیش

دسمبر 2017 کا شمارہ حسب معمول معلومات سے لبریز تھا۔ ابتدائی مضمون 'مولا بخش' وفاداری کی مثال پیش کرگیا۔ آج کرۂ ارض ایٹمی جنگ کے دہانے پر کھڑا ہے۔ آپ نے اقوام متحدہ پر بروقت مضمون پیش کیا ہے اور بچے ان کو بار بار پڑھ رہے ہیں۔ اسی شمارے میں سال اور کیسورینا درختوں کے بارے میں نایاب معلومات حاصل ہوئیں مثلاً کہ سال کی گٹھلیوں سے چاکلیٹ بنتا ہے ہمیں بالکل بھی معلوم نہ تھا۔ اُدھر سیلفی کھینچنے کی عادت کے کیا نتائج ہوسکتے ہیں کسی اور میگزین نے بچوں کو خبردار نہیں کیا۔ لیکن ہاں صفحہ 53 پر البرٹ آئین اسٹائن کی تصویر تو اچھی لگی مگر جناب تصویر میں ان کے دستخط تو نظر نہ آئے۔ کیا تھے ہی نہیں۔

پروفیسر موہن سنگھ، (ریٹائرڈ) خالصہ کالج، امرتسر

فطری امر ہے کہ انسان ازل سے خوبصورتی اور جاذب نظر چیزوں کا دلدادہ رہا ہے۔ نظروں کو ہمیشہ اچھی باتیں، اچھی تحریریں اور پرکشش چیزیں متوجہ کرلیتی ہیں؟ 'بچوں کی دنیا' بھی ایسی ہی خصوصیات کے باعث التفات کا سبب بن گیا ہے۔ بچوں کی دنیا سے ہر عمر کے افراد کا جڑے رہنا اس واحد رسالہ کی انفرادیت ہے جس رسالہ کا اوّل تا آخر نظر استحسان کا موجب ہو۔ اس کی محبوبیت اور مقبولیت کو اعتبار حاصل ہونا یقینی بن جاتا ہے۔ مختلف مزاج و معیار کے مواد کا انتخاب ہی کسی رسالے کو بامراد بنانے کی وجہ بنتی ہے۔ جناب انصار احمد معروفی (مئو، اترپردیش) کا مشورہ قابل غور ہے کہ 'قسط وار' تخلیقات سے گریز کیا جائے۔ اس مہینہ میں 'الفاظ معنی' کی کمی کا احساس ہوا۔

ہیں بچوں کی دنیا میں ساری وہ باتیں
پنپتی ہیں جیون کی جن سے وہ ذاتیں

احمد وکیل علیمی، ہیڈ ٹیچر کولکاتا میونسپل کارپوریشن اسکول، کانکی نارہ

مکرمی! میں ایک ٹیچر ہوں لیکن بچوں کی دنیا کا مطالعہ پابندی سے کرتی ہوں۔ ہر مہینے یہ میگزین ہمارے درمیان آتی ہے اور میرے گھر سارے لوگ اسے شوق سے پڑھتے ہیں۔ ابھی بھی میرے سامنے فروری کا نیا شمارہ موجود ہے۔ اس کی ساری کہانیاں، نظمیں اور مضامین بہت ہی دلچسپ اور معلومات کا ذریعہ ہیں۔ احرار حسین صاحب کا مضمون 'نوبل انعام' بہت ہی دلچسپ رہا۔ بہت ساری چیزیں جو ہمیں معلوم نہیں رہتیں وہ بچوں کی دنیا سے پتا چلتی رہتی ہیں۔

شعاع اسد، ریوڑی تالاب، وارانسی

عظیم اقبال

کلینڈر کی کہانی

عزیز دوستو!

اب تک آپ کے کمروں میں نئے سال کے کلینڈر آویزاں ہو چکے ہوں گے، سچ تو یہ ہے کہ نئے سال کی آمد کے ساتھ ہی نئے کلینڈروں کی دستیابی ہونے لگتی ہے۔ یک لخت پرانے کلینڈر اُتر جاتے ہیں اور اپنی خوب صورتی کے باوجود وہ بھلا دیے جاتے ہیں۔

کلینڈر جہاں اپنی رنگارنگی سے کمروں کی زینت بڑھاتے ہیں وہیں بدلتے ہوئے دن، مہینے اور سال سے بھی آشنا کرتے ہیں۔ ان میں تہواروں اور دیگر یادگار موقعوں سے وابستہ چھٹیاں نشان زد ہوتی ہیں۔ جن کا ہم انتظار کرتے ہیں۔

قدیم یونانی تہذیب میں، کلینڈس کا مطلب تھا 'چلّانا'۔ اُن دنوں ایک شخص ڈھول پیٹ کر بتایا کرتا تھا کہ کل کون سی تاریخ ہے، تیوہار کیا ہے، پرب کیا ہے، نیل ندی میں سیلاب آئے گا یا بارش ہوگی۔ اس چلنے والے کے نام پر ہی 'ڈیٹ ڈھو کلینڈس از کلینڈر' بنا— ویسے لاطینی زبان میں کلینڈس کا مطلب حساب کتاب کرنے کا دن مانا گیا— اسی بنیاد پر دنوں، مہینوں اور برسوں کا حساب کرنے کو 'کلینڈر' کہا گیا۔

ایک زمانہ تھا، جب کلینڈر نہیں تھے۔ لوگ تجربے کی بنیاد پر عمل پیرا ہوتے تھے۔ ان کا یہ تجربہ فطری کاموں کے بارے میں تھا۔ بارش، سردی، گرمی، پت جھڑ وغیرہ سے الگ الگ کام کرنے کے اشارے ہوتے تھے۔ مذہبی، معاشرتی، تقریبات اور کھیتی کے کام بھی انھیں پر قائم تھے۔ لیکن ان کی بنیاد پر وقت کی صحیح تقسیم مشکل ہوجاتی تھی۔

لوگوں نے محسوس کیا کہ دن، رات کی تقسیم میں کوئی گڑ بڑ نہیں ہوئی۔ اس طرح رات میں چاند دکھائی دینے کا بھی ایک سلسلہ ہے۔ چاند دکھائی دینے کا یہ سلسلہ متعین وقت کے بعد ضرور جاری رہتا ہے۔ یوں، دن رات اور چاند کی تبدیلی کی بنیاد پر دنوں کا شمار کیا گیا۔ پر اس دورانیے کو نام دیا گیا۔ ستارے اور چاند صرف غروب آفتاب کے بعد دکھائی دیتے۔ اور غروب آفتاب کے بعد تاریکی ہوجاتی۔ اس لیے اس وقفے کو رات سے موسوم کیا گیا۔

طلوع آفتاب سے لے کر غروب آفتاب کے وقفے کو دن کا نام دیا گیا۔ یہ بھی مشاہدہ ہوا کہ موسم سورج کے سبب بدلتے ہیں۔ چاند کی گردش، نئے چاند سے نئے چاند تک پائی

گئی۔ آفتاب کی ایک گردش، ایک موسم سے دوسرے موسم تک مانی گئی۔ چاند کی ایک گردش ساڑھے اُنتیس (29½) دنوں میں پوری ہوتی ہے۔ اُسے مہینہ کہا گیا۔ سورج کے چاروں موسموں کو ملا کر سال کہا گیا۔ پھر شمار کے لیے کیلنڈر کی پیدائش ہوئی۔

الگ، الگ ممالک نے اپنے اپنے طور سے کیلنڈر بنائے، کیونکہ بہ یک وقت زمین کے مختلف حصوں میں دن، رات اور موسموں میں اختلاف ہوتا ہے۔

لوگوں کی زندگی، کھیتی، تجارت وغیرہ— ان باتوں سے اثرانداز ہوتی تھیں۔ اسی لیے ہر ملک نے اپنی آسانی کے مطابق کیلنڈر بنائے۔ سال کی ابتدا کیسے کریں، اس کے لیے کس اہم واقعے کو قاعدہ مانا گیا۔ کہیں کسی حکمراں کی تخت نشینی (وکرم سنبھو) سے گنتی شروع ہوئی تو کہیں حکمرانوں کے نام سے، جیسے روم، یونان، شک، وغیرہ۔

بعد میں تو حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش (عیسوی سنہ) یا حضرت محمدؐ کے ذریعے مکہ سے ہجرت (ہجری سنہ) سے کیلنڈر بنے اور رائج ہوئے۔

روم کا سب سے پرانا کیلنڈر وہاں کے حکمراں 'پنوما پومیانس' کے وقت کا مانا جاتا ہے۔ یہ حکمراں حضرت عیسیٰ سے قبل ساتویں صدی میں تھا۔ آج ساری دنیا میں جو کیلنڈر رائج ہے، اس کی بنیاد رومی شہنشاہ جولیس سیزر کا عیسیٰ قبل پہلی عیسوی میں بنایا گیا کیلنڈر ہی ہے۔ جولیس سیزر نے کیلنڈر کو درست بنانے میں یونانی ماہر نجوم 'سوسی زی نیس' کی مدد لی تھی۔ اس نئے کیلنڈر کی ابتدا جنوری سے مانی گئی ہے۔ اسے عیسیٰ کی پیدائش سے چھیالیس (46) سال قبل نافذ کیا گیا تھا۔

جولیس سیزر کے کیلنڈر کو عیسائی مذہب کے پیروکار سارے ممالک نے قبولیت بخشی۔ انھوں نے سالوں کی گنتی حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے کی۔ پیدائش سے قبل سال کو بی سی (B.C Before Christ) کہا گیا۔ بعد کے سال اے، ڈی (A.D After Death) کہے گئے۔ پیدائش سے قبل کے برسوں کی گنتی پیچھے سے آتی ہے۔ پیدائش کے بعد کے برس کی گنتی آگے کی طرف بڑھتی ہے۔ سو سال کی ایک صدی ہوتی ہے۔

دنیا کے سارے ممالک اب ایک وقت مانتے ہیں، اور آپس میں تال، میل بٹھا کر گھڑیوں کو درست رکھتے ہیں۔ آج وقت کی پابندی بہت اہم ہوگئی ہے اور لوگ اس کی اہمیت سمجھنے لگے ہیں۔

کیلنڈر اپنی ظاہری اور باطنی خوبیوں کے سبب مہذب اور متمدن زندگی کے ناگزیر جزو بن چکے ہیں۔ وہ ہمیں متحرک کرتے ہیں اور بھاگتے دوڑتے وقت کا ہم قدم بننے پر آمادہ کرتے ہیں۔

■

Azim Iqbal
Adabistan, Ganj No-1
Bettiah - 845438 (Bihar)

محمد اعجاز

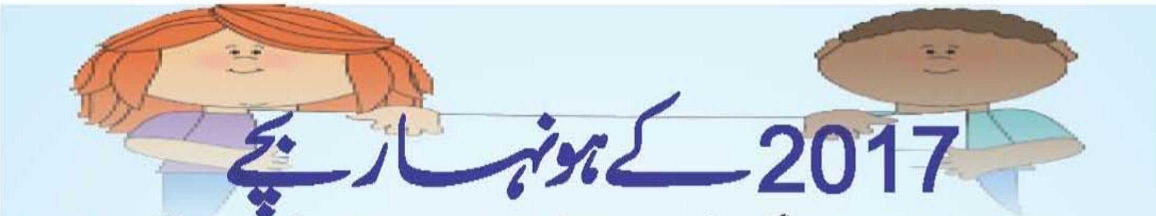

2017 کے ہونہار بچے

سال 2017 ہم سے رخصت ہو چکا ہے لیکن اس کی یاد ہمیں اس لحاظ سے بھی آتی رہے گی کہ دنیا بھر کے کچھ بچوں نے اس سال ایسے کارنامے انجام دیے جنھیں ہمیشہ یادرکھا جائے گا۔ ہم ذیل میں کچھ ایسے ہی بچوں کا ذکر کر رہے ہیں۔

دانش محمود: عمر 14 سال کلاس 9

استونیا Estonia کی راجدھانی ٹیلن Tallin میں منعقد European Union Contest For Young Scientists 2017 میں کناڈا کے رہنے والے دانش محمود فاتح بنے۔ 26 ستمبر 2017 کو اس مقابلے کے نتیجے کا اعلان کیا گیا۔ نویں کلاس کے طالب علم دانش محمود کو یہ انعام wireless interconnected non invasive system بنانے کے لیے دیا گیا۔ اس سسٹم میں ایک سینسر (sensor) شامل ہے جسے انگلی میں پہنا جاسکتا ہے۔ یہ سینسر (Sensor) دل کی بیماری، جسم کے درجہ حرارت اور بلڈ پریشر سمیت دیگر کئی بیماریوں کی علامات کا پتہ لگاتا ہے۔ دانش کے مطابق، ایسی بیماریوں کی جانچ کے لیے اکثر مریض کو گھنٹوں ویٹنگ روم میں گزارنا پڑ جاتا ہے۔ ایک بار ان کو بھی ایسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا، تب ان کے دماغ میں اس سسٹم کو بنانے کا خیال آیا۔ دانش کو انعام کی شکل میں 7000 یورو یعنی لگ بھگ پانچ لاکھ تیس ہزار روپے ملے۔

پرنے وَراڈا: عمر 14 سال کلاس 8

ہندوستانی نسل کے امریکی طالب علم پرنے وراڈا اس سال باوقار National Geographic Bee مقابلے میں کامیاب ہوئے۔ مئی 2017 میں جاری کیے گئے نتیجے میں پرنے وراڈا کو پچاس ہزار امریکی ڈالر یعنی تقریباً 32 لاکھ روپے کا انعام ملا۔ ٹیکساس میں رہنے والے پرنے وراڈا آٹھویں کلاس میں پڑھتے ہیں۔ پرنے وراڈا سال 2016 میں بھی اس مقابلے میں دوسرے نمبر پر تھے۔

سنی پوار: عمر 8 سال، ممبئی

26 فروری 2017 کو 89ویں آسکر Oscar تقریب میں پہنچنے والے سنی پوار ملک اور دنیا کے سب سے کم عمر کے فن کار ہیں۔سنی اپنی فلم Lion کے لیے وہاں پہنچے۔ سنی نے فلم میں دیو پٹیل کے بچپن کا کردار نبھایا ہے۔ ممبئی کے کلینا جھگی بستی میں رہنے والے سنی پوار گورنمنٹ ایئر انڈیا ماڈرن اسکول کا طالب علم ہے۔

گیتانجلی راؤ: عمر 11 سال، امریکا

ہندوستانی نسل کی امریکی طالبہ گیتا نجلی راؤ نے دنیا کی سب سے ینگ سائنٹسٹ (young scientist) ہونے کا خطاب اس سال 18 اکتوبر کو اپنے نام کیا۔ گیتا نجلی ساتویں کلاس کی طالبہ ہے۔ انہوں نے پانی میں لیڈ (سیسا) آلودگی کا پتہ کرنے کا آسان طریقہ ایجاد کرکے امریکا کی ٹاپ ینگ سائنٹسٹ ایوارڈ کو حاصل کیا۔

وانگ پوک لو: عمر 13 سال، اسکاٹ لینڈ

ہانگ کانگ نسل کے برٹش طالب علم وانگ پوک لو نے

صرف 13 سال کی عمر میں گریجویٹ کی ڈگری حاصل کر کے سب سے کم عمر میں گریجویٹ ہونے کا ریکارڈ بنایا ہے۔ وانگ کو حساب سبجیکٹ میں سو فیصد نمبرات حاصل ہوئے۔ وانگ بچپن ہی سے حساب میں کافی تیز تھے۔ انہوں نے اپنی ہائر سکنڈری صرف 11 سال میں پوری کی تھی۔ پھر وانگ پوک لو اسکاٹ لینڈ آگئے۔

رفعت شاروق: عمر 18 سال کلاس 12

تمل ناڈو کے پلاپٹی کے رہنے والے رفعت شاروق نے دنیا کا سب سے ہلکا سیٹلائٹ بنایا۔ اس سیٹلائٹ کا وزن 64 گرام سے بھی کم ہے جسے ناسا کے ذریعے 22 جون 2017 کو لانچ کیا گیا۔ رفعت نے اس سیٹلائٹ کا نام کلام سیٹ رکھا۔ یہ کسی بھی ہندوستانی طالب علم کا بنایا ہوا پہلا سیٹلائٹ ہے جسے ناسا نے لانچ کیا۔

جے شیل بدھ دیو : عمر 8 سال کلاس 3

گروگرام، ہریانہ کے رہنے والے جے شیل کو اس کی

غیر معمولی صلاحیت کے لیے اس سال 14 نومبر کو راشٹریہ بال پرسکار کے رجت پدک سے نوازا گیا۔ جے شیل چھوٹی سی عمر میں فن موسیقی میں ماہر ہیں۔ اس فن کا استعمال کرتے ہوئے لوگوں کو صفائی کی ترغیب دیتے ہیں۔

موئل جونڈی: عمر 16 سال، سیریا

سیریا کے موئل جونڈی کو سیریائی پناہ گزیں بچوں کے اختیارات کو یقینی بنانے کی کوشش کے نتیجے میں 4 دسمبر کو International Children's Peace Prize 2017 سے نوازا گیا۔ جونڈی موئل خود ایک جنگی پناہ گزیں ہیں۔ انھوں نے بیکا گھاٹی میں قائم پناہ گزینوں کے خیمے میں اپنے خاندان کے ساتھ مل کر اسکول کی بنیاد ڈالی ہے۔ یہ اسکول ابھی 200 بچوں کو تعلیم مہیا کرا رہا ہے۔ جونڈی کے مطابق اسکول صرف وہ جگہ نہیں ہے جہاں آپ پڑھنا اور لکھنا سیکھتے ہیں بلکہ یہ ایک ایسی جگہ بھی ہے جہاں آپ دوست بنا سکتے ہیں اور یادوں کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

منوج آکاش: عمر 16 سال کلاس 10

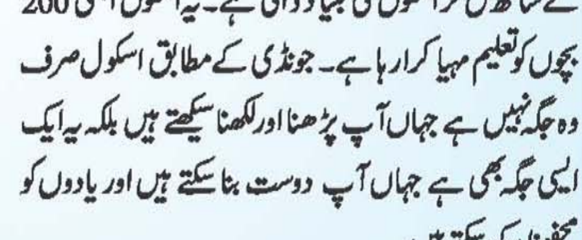

یوم اطفال کے دن صدر جمہوریہ ہند رام ناتھ کووند نے تمل ناڈو کے منوج کو راشٹریہ بال پرسکار (National Bravery Award) کے سورن پدک سے نوازا۔ بنا کسی تکلیف کے دل کے دورے یعنی سائلنٹ ہارٹ اٹیک کا پتہ لگانے والے آلے کے ایجاد کے لیے انہیں یہ انعام ملا۔ منوج کے ذریعہ بنایا گیا آلہ 6 گھنٹے پہلے ہی سائلنٹ ہارٹ اٹیک کا پتہ لگا سکتا ہے۔

انجلی گایک واڑ: عمر 11 سال احمد نگر مہاراشٹر

singing reality show Sa Re Ga Ma Pa Little champs 2017 کو اس سال دو فاتحین ملے۔ یہ سارے گاما پا لٹل چیمپس کا چھٹا سیزن تھا۔ سبھی نے اپنے گیت سے دس ہفتے تک لوگوں کو بھرپور لطف اندوز کیا۔ اکتوبر ماہ میں ہوئے اس کے گرینڈ فنالے میں مہاراشٹر کی انجلی گایک واڑ کو کولکاتہ کے شرین بھٹاچاریہ (Shreyan Bhattacharya) کے برابر نمبر ملے۔

شرین بھٹا چاریہ: عمر 12 سال، مغربی بنگال

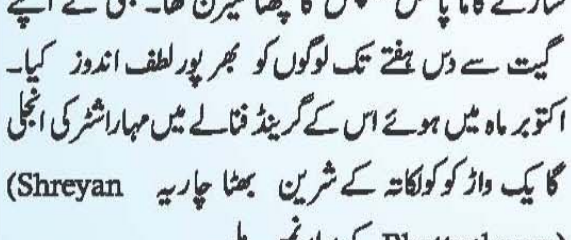

اس سال 30/ اکتوبر کو ہوئے Saregama pa little champs کے گرینڈ فنالے میں شرین نے اپنی میٹھی آواز میں کئی اچھے گانے گائے۔ شرین بھٹا چاریہ کے مطابق وہ امیتابھ بچن کے ساتھ گانا چاہتے ہیں۔ کولکاتہ میں اپنے والدین کے ساتھ رہنے والے شرین پہلے ہی ایک بنگالی فلم کے لیے گا چکے ہیں۔

ہرش وردھن سنگھ جالا: عمر 14 سال کلاس 10

گجرات میں اس سال ہوئے Vibrant Gujarat Global Summit 2017 میں 12 جنوری کو ہرش وردھن جالا نے گجرات سرکار کے ساتھ پانچ کروڑ کے ایم او یو پر دستخط کیے۔ دراصل احمد آباد کے ہرش وردھن نے ایسا ڈرون بنایا ہے جو لینڈ مائنس کا پتہ لگا سکے گا۔ اس ڈرون کی مدد سے اسے ناکارہ بھی کیا جا سکے گا۔ اس انوکھے ڈرون میں آر جی بی سینسر اور تھرمل میٹر لگا ہے۔

■

Mohd Ejaz
Raja Tola, Harlakhi
Post: Harlakahi, Via: Imgaon Kothi
Madhubani-847240 (Bihar)

پہیلیاں جوابات: (1) روٹی (2) ریفریجریٹر (3) سیلنگ فین (4) گھڑی (5) سورج

گرمیاں آگئیں

ذرّے ذرّے پہ بجلی سی برسا گئیں
جس کو بھی چھو لیا اس کو گرما گئیں
گرمیاں آگئیں
گرمیاں آگئیں

ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کا موسم گیا
کالی کالی گھٹاؤں کا موسم گیا
گرمیاں آگئیں
گرمیاں آگئیں

دھوپ میں پاؤں مٹی پہ جو پڑ گیا
دھوپ میں کیا رکھا آگ پر رکھ دیا
گرمیاں آگئیں
گرمیاں آگئیں

دھوپ میں گھر سے باہر نہ جائے کوئی
جان کر لو کا جھونکا نہ کھائے کوئی
گرمیاں آگئیں
گرمیاں آگئیں

میز بھی گرم ہے، کھاٹ بھی گرم ہے
فرش بھی گرم ہے، ٹاٹ بھی گرم ہے
گرمیاں آگئیں
گرمیاں آگئیں

چلتے چلتے جو پنکھا ذرا رُک گیا
جھٹ پسینے کا دریا سا بہنے لگا
گرمیاں آگئیں
گرمیاں آگئیں

گرم پانی ہے کوئی پیے کس طرح
اور نہ پانی پیے تو جیے کس طرح
گرمیاں آگئیں
گرمیاں آگئیں

لیجیے گھر میں باہر سے برف آگئی
سارے بچوں میں پیدا ہوئی کھلبلی
گرمیاں آگئیں
گرمیاں آگئیں

برف والی کٹوری جو منہ سے لگی
سچ یہ ہے جان میں جان ہی آگئی
گرمیاں آگئیں
گرمیاں آگئیں

■

ماخذ: بچوں کی نظمیں، مصنف: جگن ناتھ آزاد،
ناشر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

نظم

ذکیہ مشہدی

بلّی آئی

بلی آئی، بلی آئی
ایران سے سیدھے دلی آئی
نام تھا اس کا ماہ بانو
بچے کہتے اس کو مانو
دِکھتی تھی وہ شیر کی خالہ
ہاتھ سے چھوؤ تو روئی کا گالہ
آنکھیں نیلی بال سنہرے
مانو کے تھے چھکے پنجے
چکن کلیجی، مٹن قیمہ
اس سے پہلے دودھ بھی پینا
لاڈ میں وہ تو خوب ہی بگڑی
بیٹھے بیٹھے شرارت سوجھی
سب بچوں کی پیاری مانو
درخت پہ چڑھ کے بیٹھی مانو
نیچے دیکھا چکر آیا
میاؤں میاؤں شور مچایا
آصف دوڑے واصف دوڑے
نیلو دوڑی، صابر دوڑے
امی دوڑیں، پاپا دوڑے
پیچھے سے مالی کاکا دوڑے
جتنے موتہہ اتنی باتیں
مانو کو اب کیسے اتاریں
مالی کاکا لگّھی[1] لائے
آصف واصف کرسی لائے
مانو صاحبہ نیچے آئیں
خرخر کی، ذرا نہ پچھتائیں
یہ بلی ہے کہ شیطان کی خالہ
کیوں کہتے ہیں شیر کی خالہ
پھر بھی لگتی پیاری مانو
سب بچوں کی دلاری مانو

[1] لگّھی: بانس کا مضبوط لانبا ڈنڈا

Zakia Mashhadi
F-1, Grand Pallavi Court, Judges,
Court Road
Patna - 800004 (Bihar).

مچھر

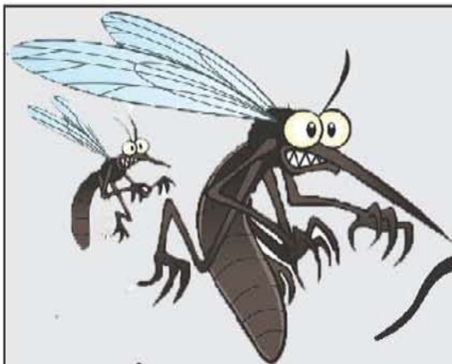

بچو ! میں ہوں کالا مچھر
سب کو لگتا ہے مجھ سے ڈر
سوئی چبھوتا ہوں میں بدن میں
آگ سی لگ جاتی ہے تن میں
میری دشمن مچھر دانی
میرا گھر ہے گندا پانی
اس میں پلیں مچھر کے انڈے
جن سے نکلیں ننھے بچے
پیتے ہیں وہ خون تمھارا
خون پہ ہے ان سب کا گزارا
کانوں میں ہوں ساز بجاتا
مفت میں انجکشن ہوں لگاتا
بچو ! مجھ سے رہنا بچ کر
پھیلاؤں بیماری گھر گھر
مچھر مار دوائیں لاؤ
پھول! ان سب کو مار بھگاؤ

■

Tanweer Phool
131 Hill Crest Avenue, Albany
New York - 12203 (USA)

پریشانی سے بچو

گر تم کو پریشانی سے بچنا ہے دوستو
جو چیز ہے جہاں کی اُسے اُس جگہ رکھو
جوتوں کو ریک میں رکھو تم احتیاط سے
پانی میں اپنے موزے بھگونے کو ڈال دو
بستے کو بھی سلیقے سے تم میز پر رکھو
اسکول کے ڈریس کو ہینگر پہ ٹانگ دو
کپڑوں کو ٹھیک طرح سے الماری میں رکھو
کاپی کتابیں اچھی طرح ریک میں رکھو
صابن رکھو نہانی میں اس کے مقام پر
گیلا ہے تولیہ اسے رسی پہ ڈال دو
ہے آئینہ جہاں وہیں کنگھا رکھا کرو
اور تیل کی شیشی بھی وہیں پاس میں رکھو
پین اور پینسل کو رکھو اپنے باکس میں
چادر جھٹک کے ٹھیک سے بستر پہ ڈال دو
تکیہ کو اچھی طرح سرہانے جماؤ تم
کھانے کے بعد اپنی پلیٹیں اٹھاؤ تم
دھو کر انھیں سلیقے سے تم ریک میں رکھو
تم اس طرح سے کام کرو گے تو دوستو
چیزیں تلاش کرنے کی زحمت سے بچو گے
نظروں میں والدین کی تم اچھے بنو گے
اِس واسطے نجیب یہ کہتا ہے باربار
گر تم کو پریشانی سے بچنے کا ہو خیال
جو چیز ہے جہاں کی اُسے اُس جگہ رکھو

■

Wakeel Najeeb
Najeeb Manzil, Near Dalal School
Momin Pura, Nagpur (Maharashtra)

پہلی قسط

رفیع احمد قدوائی

زندگی کی ہماہمی سے دور گرد کے دھند میں گھرا، مسولی، ضلع بارہ بنکی کے بے تاج بادشاہ، رفیع احمد قدوائی کا 'محل' کھڑا ہے۔ یہ محل ایک میدان میں کھڑا تھا۔ اینٹوں کا بنا ہوا مکان جس کی کھڑکیوں میں سلاخیں نہ تھیں۔ ایک ٹوٹی پھوٹی چھت کے نیچے اینٹوں کے کھمبوں پر کھڑا ایک برآمدہ تھا۔ اس کی حالت پکار پکار کر مرمت کا مطالبہ کر رہی تھی۔ اصلی گھر کے آگے ایک چھوٹا سا ٹین کا سائبان تھا۔ وہاں کچھ اونچے نیچے ٹیلے تھے۔ آم اور امرود کے کچھ درخت تھے ایک اکیلا لیمپ کا کھمبا، اس بات کی نشانی کہ یہ داخلے کا دروازہ ہے۔ یہ تھا وہ مکمل 'شاہی' احاطہ اور بس۔

"یہ... ان سے قریبی تعلق رکھنے والے گاؤں کے ایک شخص نے کچھ بے یقینی کے ساتھ کہا "قدوائی، جو اپنی دولت ان لوگوں پر نچھاور کر دیتے تھے جو ان سے مدد چاہتے تھے لیکن جہاں تک خود اپنے پر خرچ کرنے کا سوال ہے وہ بہت جزرس تھے۔"

ایک دوست جو ایک بنک کا ڈائرکٹر تھا لکھنؤ سے جنازے کے ساتھ آخری رسوم میں شرکت کے لیے ساتھ گیا تھا۔ اس نے اپنے گلے کو صاف کیا اور کہا "ان کا انتقال ہوا تو وہ مقروض تھے" یقیناً یہ حیرت انگیز انکشاف تھا۔ "گھبرایئے نہیں۔ ہمیں جیسے ہی ان کے انتقال کی خبر ملی، ڈائرکٹرس کے بورڈ نے متفقہ فیصلہ کیا کہ ان کی طرف بینک کا جو حساب تھا، اسے قلم زد کر کے ختم کر دیا جائے۔ ہر شخص واقف تھا کہ اس نیک شخص نے ایک پیسہ بھی اپنے اوپر خرچ نہیں کیا تھا۔

زبردست مجمع میں بہت سی باتیں لوگوں نے بتائیں۔

"میاں مرحوم نے کتنے بچے چھوڑے۔" کسی شخص نے پوچھا۔

"کہتے ہیں کہ ان کا اپنا کوئی بچہ نہ تھا لیکن میں جانتا ہوں کہ ان کے اٹھ جانے سے ہزاروں بچے یتیم ہوگئے۔" دوسرے نے جواب دیا۔

کسانوں اور پارلیمنٹ کے لوگوں کا یکساں سرپرست،

رفیع احمد قدوائی، مسولی کا 'بے تاج بادشاہ' تھا۔ وہ آزادی کی جدوجہد کا سچا سپاہی تھا۔ بہترین منتظم تھا، صحیح معنوں میں قوم پرست تھا جس کا مذہب لوگوں سے محبت کرنا تھا۔

ایک چھوٹے قد کے سفید کھدر کا کرتا پائجامہ، ایک جھریاں پڑی، دودھیا رنگ کی اچکن اور ایک گاندھی ٹوپی پہنے تیز تیز قدموں سے چلتے گھر سے باہر آتے تھے۔ ان کے ساتھ دوستوں اور ہمنوا لوگوں کی لمبی لائن ہوتی تھی۔ ان لوگوں میں ہلکی پھلکی بات چیت اور ہنسی مذاق بھی چلتا رہتا تھا۔

تقریباً ساڑھے سات سو برس پہلے مستان شاہ قاضی قدوا کے خاندان سے ایک عالم تھے۔ انھوں نے ضلع بارہ بنکی میں گاؤں مسولی آباد کیا۔ رفیع احمد قدوائی کے پردادا ظہیرالدین عرف گھرّن میاں کو ان کی نیک طبیعت اور نواب اودھ سے عقیدت کی وجہ سے عوام بہت پسند کرتے تھے۔ چھدا میاں، ان کے بھائی جو بہادری کے لیے بہت مشہور تھے، انھوں نے قومی خدمت میں جان دے دی۔ یہ خاندان بارہ بنکی کے قدوائی خاندان کے نام سے مشہور ہوا۔

18 فروری 1894 کی ایک سرد صبح کو قاضی صاحب کے خاندان کے ایک فرد ممتاز علی بے چینی کے ساتھ اپنے پہلے پوتے کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ ممتاز علی کے بیٹے امتیاز علی کو مسولی کے لوگ پیار میں لالہ میاں کہتے تھے۔ امتیاز علی بھی اپنے بزرگوں کی طرح فراخ دل تھے۔ ان کی بیوی رشید النسا بھی ان ہی کی طرح شریف تھیں۔ ان بے چینی کے لحات میں ممتاز علی نے اپنے ذہن کو بٹانے کی کوشش کی۔ صحن میں غلے کی صفائی کا کام ہو رہا تھا۔ روزمرہ کے کام کی طرح وہ اسے دیکھنے لگے۔ یکا یک تھالی بجنے کی آواز نے پریشانی کو ختم کر دیا۔ دائی نے رفیع احمد کی پیدائش کا اعلان کیا۔ ممتاز علی نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور دعا کی کہ اس پوتے کو لوگوں کی محبت ملے۔

صحن میں غلے کی صفائی کا کام ہورہا تھا روزمرہ کے کام کی طرح وہ اسے دیکھنے لگے۔ یکایک تھالی بجنے کی آواز نے پریشانی کو ختم کردیا دائی نے رفیع احمد کی پیدائش کا اعلان کیا ممتاز علی نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور دعا کی کہ اس پوتے کو لوگوں کی محبت ملے۔

رفیع احمد نے ابتدا ہی سے اپنے بزرگوں کے اثرات کا اظہار کیا۔ وہ شریف سچے اور کھرے تھے۔ ان کے بچپن ہی میں ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ ان کے والد نے دوسری شادی کی۔ رفیع احمد اپنی سوتیلی ماں کی بہت عزت کرتے تھے اور اپنے بھائیوں شفیع احمد اور محفوظ احمد سے بہت محبت کرتے تھے۔ کبھی کسی نے انھیں غصے میں بھڑکتے نہیں دیکھا۔ یہاں تک کہ کھیل اور کشتی میں بھی انھیں غصہ نہیں آتا تھا۔

دولت مند زمینداروں کے لڑکے آپسی جھگڑوں، کبوتر بازی اور غیر ضروری گپ میں اپنا وقت گزارتے تھے لیکن رفیع احمد اپنے والد کے سخت ڈسپلن میں رہتے تھے۔ انھوں نے اپنے ہم عمر لڑکوں کی عادتیں اختیار نہ کیں۔ وہ دولت مندی کے اظہار کو پسند نہ کرتے تھے۔ وہ سادگی پسند تھے اور پڑھنے

لکھنے کے شوقین تھے۔ ایک مشہور پہلوان حاجی چھوٹک رفیع کے استاد بنائے گئے۔ چھوٹک بھی ڈسپلن کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ ان کی نگرانی کے زمانے میں رفیع نے سادگی ار دوسروں کے ساتھ دوستانہ انداز اختیار کیے۔

ان کے والد سرکاری ملازم تھے اور ان کے زیادہ دن ملازمت کے سلسلے میں دوروں میں گزرتے تھے۔ اس لیے رفیع احمد کو ان کے چچا ولایت علی کے پاس بارہ بنکی بھیج دیا گیا۔ چنانچہ وہ دور جو شخصیت کی تعمیر کا زمانہ ہوتا ہے ان کے چچا کے ساتھ گزرا۔ وہ اپنے چچا سے بھی بہت محبت کرتے تھے۔ ان کے چچا بارہ بنکی کے ایک بڑے وکیل تھے۔ ان کے خیالات اور اصولوں کا رفیع احمد پر بہت اثر پڑا۔ قوم پرستی کے بارے میں ان کے پرجوش انداز نے بھی رفیع احمد کو خوب متاثر کیا اور ان میں انگریزوں کے خلاف جذبہ پیدا ہو گیا۔

رفیع احمد نے 1913 میں بارہ بنکی کی گورنمنٹ ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور آگے تعلیم حاصل کرنے کی خواہش کی۔

رفیع احمد نے 1914 میں ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ اس کالج نے بہت سے قوم پرست لیڈر پیدا کیے۔ ایک قومی کلچر کو فروغ دیا۔ غیر ملکی حکومت کے خلاف جذبہ پیدا کیا اور اپنے ملک سے محبت کا جذبہ پروان چڑھایا۔ کالج کے ماحول نے ان کے دل میں چھپے قومیت کے خیالات کو اور ترقی دی اور جلد ہی انھیں ایک خطرناک انقلابی سمجھا جانے لگا۔ وہ کچھ شرمیلے سے آدمی تھے۔ اس لیے پرجوش تقریریں نہیں کرتے تھے۔

ان کی تنظیمی صلاحیت نے کالج الیکشن کے بارے میں فیصلے لینے میں مدد کی۔ انھوں نے سیاسی تدبیریں سیکھیں اور ان میں ترقی ہوتی رہی۔ کالج کے تجربات نے ان کی سیاسی زندگی میں بہت مدد کی۔ خود کو پیچھے رکھتے ہوئے کام کرنے کا انداز

انھوں نے اختیار کیا۔ کالج کے علاقے میں نسبتاً معمولی باغیانہ اختلافات نے ان میں جذبۂ بغاوت کی پرورش کی۔ نیوا ایرا، اور کامریڈ میں گوپال کرشن گوکھلے اور لوکمانیہ بال گنگا دھر تلک کے مضامین نے انھیں تقویت بخشی۔ قدوائی نے جارج برنارڈشا، جی کے چیسٹرٹن اور ایچ جی ویلس کو بھی بڑی توجہ سے پڑھا۔

1918 میں ان کو ایک تلخ جھٹکا لگا۔ ان کے چچا کا اچانک انتقال ہوگیا۔ قدوائی نے اپنی چچی اور چچا زاد بہن بھائیوں کی دیکھ بھال کی ذمے داری اپنے سر لے لی۔ اطمینان انھیں صرف اپنی بیوی مجیدالنساء کی شکل میں ملا۔ وہ بھی اپنے شوہر کے آبا و اجداد کے خاندان سے ہی تعلق رکھتی تھیں۔ وہ نرم مزاج تھیں۔ اس خاندان میں سادہ رہائش اور تہذیبی قدروں کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ انھوں نے اپنے شوہر سے قومیت کے گہرے اثرات اختیار کیے۔

1919 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں کچھ بہت بڑی تبدیلیاں پیدا کی گئی تھیں۔ اس سے ایک دوہری حکومت (ڈایارکی) کی تشکیل ہوئی تھی جس میں کچھ محکمے یا شعبے (سبجیکٹس)۔ جیسے مالیات، نظم و قانون، براہِ راست حکومت کے ہاتھ میں رزرو رہنے تھے، اور باقی محکمے... تعلیم، صحت عامہ اور مقامی حکومتیں (لوکل سیلف گورنمنٹ) ان وزیروں کو سونپے جانے تھے جنھیں عوام چن کر بھیجتی ہے۔ ظاہر ہے یہ نظام لوگوں کی اس مانگ کو کسی طرح پورا نہیں کر رہا تھا جو انھوں نے سیلف گورنمنٹ (خود اختیاری حکومت) کے روپ میں پیش کی تھی۔

اور اس کے ساتھ ہی ساتھ رولیٹ ایکٹ بھی نافذ کیا گیا جس کے ذریعے حکومت کو اختیار تھا کہ وہ جسے چاہے گرفتار کرے اور کسی عدالت میں مقدمہ چلائے بغیر جیل میں بند کردے۔ اس ایکٹ کے ذریعے حکومت عوام کی بے اطمینانی اور احتجاجی تحریکوں کو سختی سے کچل سکتی تھی۔

بے چینی اور گھبراہٹ کی ایک لہر ہندوستان میں دوڑ گئی۔ احتجاج کے طور پر گاندھی جی نے عدم تشدد کی بنیاد پر عدم تعاون کی تحریک شروع کی۔ گاندھی جی کی رہنمائی میں رولیٹ ایکٹ کے فوراً بعد جلیان والے باغ کا بھیانک قتل عام 13 اپریل 1919 کو ہوا۔ یہ حادثہ میخائل اوڈائیر کی گورنری میں ہوا تھا۔ سیکڑوں نہتے لوگوں کو گولیوں سے بھون دیا گیا یا زخمی کردیا گیا۔

اس موقعے پر قدوائی کھل کر سامنے آگئے اور انھوں نے غیر ملکی کپڑے کے بائیکاٹ کے لیے رضا کار تیار کیے۔ انھوں نے لوگوں میں سیاسی شعور ابھارنے اور سیاست اور عام زندگی میں عدم تشدد کے پرچار کا کام سنبھالا۔ ان کا پختہ یقین تھا کہ ہندو اور مسلمان جو صدیوں سے ساتھ رہے ہیں اور ان کی اَن گنت نسلوں نے ملک کی تاریخ میں ساتھ ساتھ حصہ لیا ہے، انھیں آئندہ بھی ساتھ ہی رہنا ہے اور اس لیے یہ ان کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ ان طاقتوں کو ناکام بنائیں جو اس برادری اور ایکتا کو تباہ کرنے کی درپے ہیں اور جب دونوں کا مقصد آزادی حاصل کرنا ہوگا تو یہ اتحاد بھی لازمی طور پر حاصل کرنا ہوگا۔ چنانچہ یہ فرقہ وارانہ اتحاد اور میل جول کے پیغام کو پھیلانے کے لیے گاؤں گاؤں پیدل پھرے۔ انھوں نے جلسے کیے، احتجاجی مظاہرے منظم کیے مگر جہاں تک ممکن ہوسکا عام پبلک میں تقریر کرنے سے گریز کیا۔

1922 میں قدوائی اپنے بھائی شفیع احمد کے ساتھ گرفتار ہوئے، شفیع احمد نے قومی جدوجہد میں حصہ لینے کے لیے اپنی

ملازمت سے استعفیٰ دیا تھا۔ اس موقعے پر قدوائی کو قید سخت بامشقت کی سزا ہوئی۔ انھیں سیکڑوں دوسرے رہنماؤں کے ساتھ جیل میں ڈال دیا گیا۔ لکھنؤ جیل میں جواہر لال اور موتی لال نہرو سے ان کے تعلقات بنے۔ ان دونوں کی قدوائی ہمیشہ بہت عزت اور قدر کرتے تھے۔

5 فروری 1922 کو چوری چورا (گورکھ پور، اتر پردیش) کے مقام پر ایک بھیانک حادثہ ہوا۔ یہاں کچھ قوم پرست، جو اب تک عدم تشدد پر عمل کر رہے تھے، ایک دم تشدد پر اتر آئے اور انھوں نے پولس کے ان سپاہیوں پر بڑی بے دردی سے حملہ کر دیا جو ان پر گولی چلا رہے تھے۔

گاندھی جی کو اس خبر سے بہت تکلیف پہنچی اور انھوں نے عدم تعاون کی تحریک واپس لینے کا فیصلہ کر لیا۔ بہت سے کانگریس کارکنوں نے گاندھی جی کے فیصلے کی مخالفت کی اور اپنا احتجاج جاری رکھا۔

دسمبر 1922 میں موتی لال نہرو اور چترنجن داس نے سوراج پارٹی شروع کی۔ ان کا خیال تھا کہ سیاسی بے اطمینانی کو ہوا دیتے رہنا قومی تحریک کو باقی رکھنے کا صحیح ذریعہ ہے۔ سوراج پارٹی کی پالیسی بنیادی طور پر بائیکاٹ پروگرام اور پارلیمنٹ میں انگریزوں کی مخالفت کرنا تھی۔

جیسے جیسے قدوائی کا سیاسی روپ آگے بڑھا ویسے ویسے ان کے خاندان پر انگریزوں کا غصہ بڑھتا گیا۔ ان کے گھروں کی تلاشی تقریباً روز کا دستور بن گئی اور ان پر بہت سے جرمانے عائد کیے گئے۔

1925 میں یکا یک رفیع صاحب دوسرے حادثے سے دوچار ہوئے۔ ان کا سات سال کا لڑکا مر گیا۔ اس اکلوتے بچے کی موت نے قدوائی اور ان کی بیوی کو توڑ کر رکھ دیا۔ مجید النسا کو صبر نہیں آ رہا تھا۔

قدوائی نے خاموشی میں اور ان کی بیوی نے خود کو سخت عبادت میں گم کرنے کی کوشش کی۔ آخر قدوائی کی بیوی نے حج کے لیے مکہ جانے کی خواہش کی۔ انھوں نے ان کے سفر اور حج وغیرہ کے سارے انتظامات مکمل کر دیے اور جب وہ حج کے لیے چلی گئیں تو وہ اپنے غم پر قابو پانے کے لیے پوری طرح کام میں لگ گئے۔

مرکزی قانون ساز

1926 میں مرکزی قانون ساز اسمبلی کے لیے الیکشن ہوئے۔ تمام رکاوٹوں کے باوجود سوراج پارٹی نے 38 جگہیں جیتیں۔ قدوائی اودھ سے چنے گئے۔ انھیں سوراج پارٹی کا چیف مقرر کیا گیا۔ ان کی زبردست قیاسی سوجھ بوجھ اور انسانی رشتوں کو مضبوط رکھنے کی صلاحیت کی وجہ سے کئی اختلافی مسئلوں کے باوجود پارٹی متحد رہی۔

قدوائی سول نافرمانی کی تحریک کو بھی دیہات تک لے گئے۔ یہاں انھوں نے اسے 'لگان نہیں' کی شکل دی۔ اپنے دورے کے دوران انھوں نے غریب کسانوں کی حالت کو دیکھا۔ گو کہ لگان کے خلاف تحریک زمین داروں کے مفاد کے خلاف تھی، لیکن انھیں یقین تھا کہ اس سے کسانوں کی پریشانیاں کچھ کم ہوں گی۔ کسان بہت پریشان تھے کہ انھیں بہت سا لگان دینا پڑتا تھا لیکن پیداوار کی قیمت کم ملتی تھی۔ ■

(جاری)

ماخذ: یاد کیجیے ہمارے رہنما(8)، مصنف: ایرا سکسینہ، مترجم: صفدر نقوی، ناشر: چلڈرن بک ٹرسٹ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، بچوں کا ادبی ٹرسٹ

مضمون

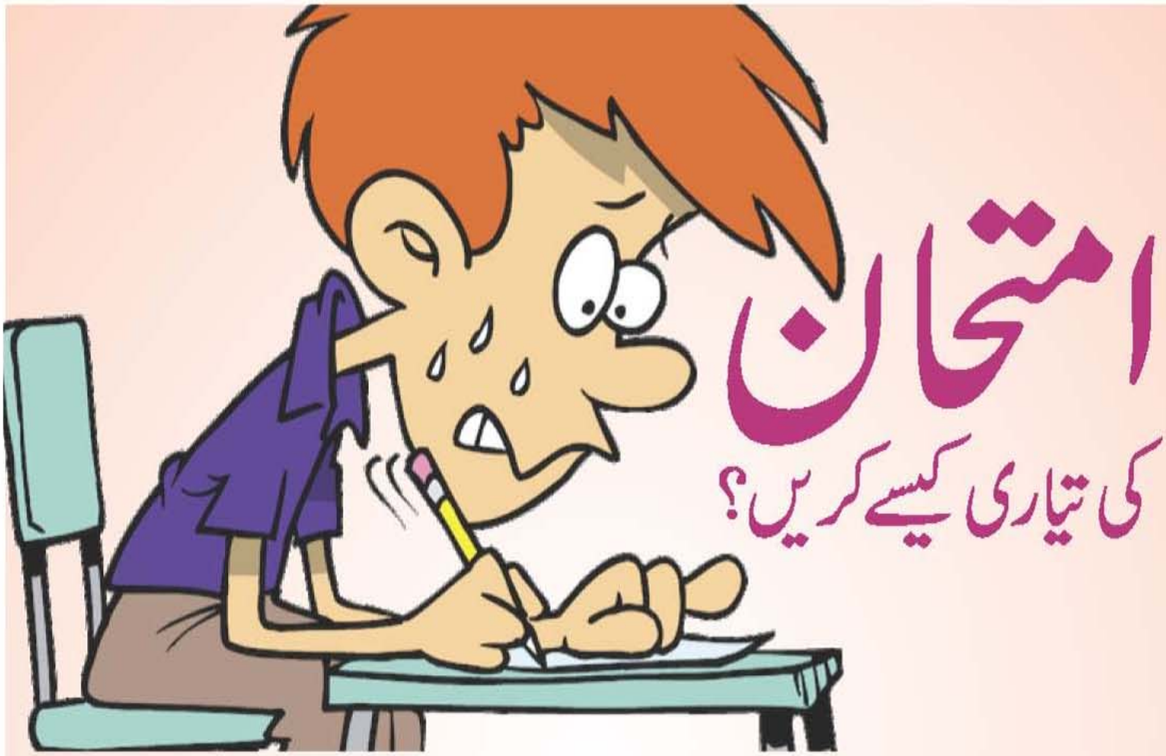

امتحان
کی تیاری کیسے کریں؟

ایس ایس سی اور ایچ ایس سی بورڈ امتحانات عنقریب ہیں۔ اس کے بعد اسکولوں کے امتحانات بھی شروع ہو جائیں گے۔ ہمارے طلبہ سال بھر امتحان کی تیاری کرتے ہیں۔ لیکن جب امتحان کا وقت آتا ہے تو گھبرا جاتے ہیں، بہت ڈر جاتے ہیں، دباؤ میں آ جاتے ہیں اور انھیں ذہنی تناؤ ہو جاتا ہے اور انھیں ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ جو کچھ انھوں نے یاد کیا ہے وہ بھول جائیں گے۔ جب کہ ایسا نہیں ہے۔ اگر ہم نے پڑھائی کی ہے تو ضرور وہ ہمیں یاد آ جائے گا۔ دنیا میں کوئی بھی کام مشکل نہیں ہے۔ کون سی چیز آسان اور مشکل کب لگتی ہے یہ سب ہماری سوچ پر منحصر ہے۔ ٹینا دابی جو کہ آئی اے ایس ٹاپر رہ چکی ہے۔ یہ اس کو بہت آسان لگا۔ اسی طرح انصار شیخ، ام الخیر، عامر اطہر ڈاکٹر شاہ فیصل نے اپنی لگاتار کوششوں سے تمام رکاوٹوں کو شکست دی اور اپنی منزل مقصود تک پہنچ گئے۔ جبکہ کئی لوگ ایسے ہیں جو کئی کوششوں کے بعد کامیاب ہوتے ہیں تو ان کے لیے یہ مشکل ہو جاتا ہے۔ جو لوگ ایس ایس سی یا ایچ ایس سی کی تیاری کرتے ہیں انھیں لگتا ہے کہ آئی اے ایس بہت مشکل ہے۔ جو آپ کو آسان لگ رہا ہے وہ پہلے کرتے جائیں، دل لگا کر کریں جس سے اس شعبے کی بلندی تک پہنچ جائیں گے۔ پڑھائی کے لیے اپنا ایک ٹارگیٹ بنا لیں کہ میں فلاں مضمون کا اتنا سبق روزانہ یاد کروں اور اسے وقتاً فوقتاً دہرایا کروں گا۔ ہر ایک مضمون کے بارے میں اپنا محاسبہ کریں کہ امتحان میں شامل اسباق میں سے کون سے اسباق آپ کو نہیں آتے یا پھر کمزور ہیں۔ ان کی ایک فہرست بنا کر اپنے کلاس میٹ یا اپنے اساتذہ سے اس مشکل یا کمزوری کو دور کر لیں۔ اسی کے ساتھ بورڈ امتحان کی تاریخ ان میں شامل مضامین کے نصاب کے بارے

میں معلومات حاصل کر کے اپنے پاس محفوظ کر لیں۔ امتحان کا خوف دور کرنے اور نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے لیے اپنے تجربات کی روشنی میں کچھ ہدایات دی جا رہی ہیں۔ یہ طلبہ کے لیے ان شاء اللہ بہت کارآمد ہوگی۔

- پڑھائی کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کریں جہاں آپ مکمل یکسوئی کے ساتھ پڑھائی کر سکیں۔ اگر کسی مجبوری کی بنا پر ایسی جگہ نہ ملے تو ایسی جگہ منتخب کریں جہاں سے آپ کو کچھ نہ کچھ یکسوئی حاصل ہو جائے۔ سبق کو بغیر سمجھے رٹنے کی کوشش نہ کریں۔ یاد کرنے کی ترتیب اس طرح رکھیے کہ پہلے آسان سبق یاد کریں پھر مشکل کی طرف بڑھیں، ذہن کو ادھر ادھر نہ ہونے دیں۔
- احادیث میں صبح اٹھنے کی بہت فضیلت ہے۔ صبح اٹھنا بہت ضروری ہے خاص طور سے امتحان کے دنوں میں کیونکہ صبح کے وقت دماغ بہت ہی پر امن، پرسکون، تازہ اور خالی ہوتا ہے اور ہم اس میں جو کچھ بھی ڈالیں وہ بہت دیر تک دماغ کی میموری میں محفوظ رہتا ہے۔ ایسے طلبہ کو جو وقت مناسب لگتا ہے وہ اس لحاظ سے بھی پڑھائی کر سکتے ہیں۔
- ضروریات سے فارغ ہو کر پڑھائی شروع کریں۔ اگر تھکن محسوس ہو تو گھر پر ہی کچھ دیر چہل قدمی کریں۔ اس کے بعد بریک لیں اور ناشتہ کریں بالکل آرام سے ناشتہ کرنا بہت ضروری ہے دماغی کام کے لیے اگر آپ ناشتہ نہیں کریں گے تو دماغ کو توانائی نہیں ملے گی اچھے سے پڑھائی کرنے کے لیے اور ناشتے میں ٹوسٹ، دودھ، کیلا، جوس، انڈا، مٹھ، چنا وغیرہ۔ ناشتہ کرنے سے آپ کو بھوک دیر سے لگے گی کیونکہ یہ توانائی کو دھیرے دھیرے ریلیز کرتا ہے۔ جس سے آپ کی توانائی بنی رہے گی۔ چکنائی والی، کھٹی اور بلغم پیدا کرنے والی اشیا سے دور رہیں۔ یہ حافظے کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ بلغم اور زکام کے علاج کے لیے موسم کے اعتبار سے وقفے وقفے سے کشمش کھانا مفید ہے۔
- اپنی صحت کا بہت زیادہ خیال رکھیں۔ کہیں ایسا نہ کہ بہت زیادہ وقت پڑھتے رہنے سے کمزوری آ جائے۔ بہت پیٹ بھر کر بھی نہ کھائیں۔ کم کھائیں اور ہلکی غذا دال، سبزی، سلاد دہی وغیرہ جس سے آپ کے جسم کو کھانا ہضم کرنے میں کم طاقت لگتی ہے اس سے سستی بھی کم لگے گی اور پوری توجہ و توانائی آپ پڑھائی میں لگا سکیں گے۔
- چھ سے آٹھ گھنٹے کی نیند بہت ضروری ہے۔ امتحان کے دنوں میں چھ سے آٹھ گھنٹے تک سوئیں۔۔ جس سے آپ تازگی محسوس کریں گے۔ اگر نیند مکمل کرنے کے بعد بھی نیند کا غلبہ محسوس ہو تو روزانہ لیموں والے پانی میں شہد کا ایک چمچہ نہار منہ استعمال کریں۔ یہ بے حد مفید ہے۔ پھر آپ جتنا پڑھ چکے ہیں اسے ایک بار سرسری طور پر دیکھ لیں۔
- فضول گفتگو سے احتیاط برتیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ زبان جتنی کم استعمال ہوگی ذہن کی توانائی اتنی زیادہ محفوظ رہے اور یہ توانائی اسباق یاد کرنے کے وقت کام آئے گی۔ جس تاریخ کو پرچہ ہو اس میں ساری رات جاگنے سے پرہیز کریں۔ ساری رات جاگنے سے صبح پرچہ دیتے وقت تھکن کا احساس ہوگا۔ ذہن پر

غنودگی چھائی رہے گی جس کی وجہ سے پوری محنت پر پانی پھر سکتا ہے۔

- امتحان سینٹر کے لیے روانہ ہونے سے قبل وہ چیزیں ضرور لے لیں جن کی امتحان کے دوران ضرورت پڑتی ہے مثلاً قلم، روشنائی، مارکر، ربر، رولر وغیرہ۔ پہلے دن امتحانی سینٹر پر جلد پہنچ جائیں تا کہ کسی قسم کی مشکلات اور پیچیدگی سے بچا جا سکے۔ امتحانی سینٹر پہنچ کر اپنا سیٹ نمبر معلو م کر کے اطمینان سے بیٹھ جائیں۔۔ ذہن کو آرام دینے کے لیے کتاب وغیرہ کا مطالعہ نہ کریں۔ طبعی ضروریات سے فراغت حاصل کر لیں۔ ہوسکتا ہے کہ دوران امتحان ممتحن آپ کو باہر جانے کی اجازت نہ دیں۔
- ذہین پر کسی بھی قسم کا ٹینشن نہ لیں کہ جانے کیا ہوگا؟ میں کچھ بھی لکھ پاؤں گا یا نہیں۔ خدا پر توکل کریں پر سکون رہیں۔ اگر ذہنی دباؤ محسوس ہو تو الائچی منہ میں ڈال لیں۔ ان شاء اللہ ذہنی دباؤ میں کمی ہونا شروع ہوجائے گی۔
- امتحان ہال میں عام طور پر جوابی کاپی پہلے دی جاتی ہے۔ جوابی پرچہ ملنے پر اپنا سیٹ نمبر لفظوں اور عددوں میں لکھیں۔ بارکوڈ اسٹیکر کو دی ہوئی جگہ پر چسپاں کریں۔ مضامین، تاریخ، سینٹر کوڈ وغیرہ مکمل طور پر پُر کریں۔ حاشیہ وغیرہ بنالیں۔
- سوال کا پرچہ ملے تو اسے مکمل توجہ کے ساتھ پڑھیں۔ دی گئی ہدایات کا بغور مطالعہ کریں۔ اس پر عمل کریں۔ سوالات کی درجہ بندی کرلیں کہ کس سوال کا جواب آپ کو بہت اچھی طرح یاد ہے؟ اور کون سے جوابات اچھی طرح سے یاد نہیں ہیں۔ سوالات حل کرنے کے لیے وقت کی تقسیم کرلیں۔ کس سوال کے جواب کے لیے کتنا وقت دینا ہے۔ پرچہ آسان ہو یا مشکل یکساں توجہ کے ساتھ حل کریں۔ کوشش کریں کہ سوالات کے جوابات ترتیب وار ہوں۔ اس سے ممتحن پر اچھا اثر پڑھتا ہے اور وہ مارکس دینے میں کنجوسی نہیں کریں گے۔
- امتحان ہال میں اپنے کسی بھی ساتھی سے کسی بھی قسم کا لین دین بالکل نہ کریں۔ کسی بھی قسم کی گفتگو نہ کریں۔ آج کل تو ہر اسکول میں کیمرہ لگا ہوا ہے۔ آپ کی ایک ایک حرکت کیمرے میں قید ہو جاتی ہے۔ آپ بھی ممتحن کی نظر میں مشکوک ہو سکتے ہیں۔
- زباندانی کے پرچے، سائنس وغیرہ کے پرچے میں ممکن ہو سکے تو عنوانات قائم کر کے جوابات لکھیں اس سے ممتحن پر اچھا اثر پڑھے گا۔ جس قدر سوالات کے جوابات آتے ہوں لکھتے جائیں اور اسی پر قناعت کریں۔ نقل کرنے کی بالکل بھی کوشش نہ کریں۔ علمائے کرام نے اس عمل کو ناجائز ٹھہرایا ہے۔ صرف اپنی عقل کو استعمال کریں۔
- تمام سوالات کے جوابات لکھ چکیں تو کم از کم ایک مرتبہ انھیں غور سے پڑھ لیں۔ جہاں غلطی نظر آئے اس کی اصلاح کر لیں۔ اگر کوئی جواب ادھورا ہو تو اسے بھی مکمل کر لیں۔

پرچہ جمع کرنے میں جلد بازی نا کریں۔ جب آپ کا نمبر آجائے تو جمع کروا دیں۔ بہت ہی نظم وضبط کے ساتھ امتحان ہال سے باہر نکلیں۔ شور وشرابا بالکل نہ کریں۔

گھر پہنچ کر ضروریات سے فارغ ہوکر مناسب آرام کرنے کے بعد تازہ دم ہوکر اگلے پرچے کی تیاری میں لگ جائیں۔

اپنے دماغ سے ہر منفی سوچ کو نکال دیں اور امتحان سے بالکل بھی نہ ڈریں۔ اگر آپ نے پڑھائی کی ہے تو ایک بار پیپر لکھنا شروع کریں تو آپ نے جو کچھ پڑھا ہے وہ یاد آتا چلا جائے گا اور آپ کی خود اعتمادی بڑھتی جائے گی۔ آپ بالکل اطمینان کے ساتھ پرچہ حل کرتے چلے جائیں گے۔ جو طلبہ نمایاں کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ تمام مضامین کے پرچوں پر یکساں توجہ دیں۔ ہر مضمون میں اچھے نمبر لے کر ہی وہ اس دوڑ میں شامل رہیں گے۔ دسویں اور بارہویں یہ آپ لوگوں کے لیے ابتدائی امتحانات ہیں۔ زندگی کے مراحل میں بھی آپ کو بہت سے امتحانات کا سامنا کرنا ہے۔ ایک طلبہ کی نمایاں کامیابی اس کے اسکول، والدین، طلبہ، پڑوسیوں، رشتہ دار یا محلہ سماج کے لیے بڑے فخر کی بات ہوتی ہے۔ طلبہ محنت کو اپنا شعار بنالیں۔ مناسب منصوبہ بندی کریں اور اپنے ٹارگیٹ کو حاصل کر کے اپنے گھر والوں اور سماج کی خدمت کا جذبہ اپنے اندر پیدا کریں۔ آپ کی ترقی قوم وملت کی ترقی ہے۔

■

Momin Fayyaz Ahmad Ghulam Mustafa
Educational & Carier Councillor
Samdia School & Junior College
Bhiwandi (Maharashtra)

Subscription Form "Bachchon Ki Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'بچوں کی دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................. بتاریخ.................. بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔ آپ 'بچوں کی دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں۔

نام:..

پتہ:..

دستخط

آسماں

کتنا اچھا ہے یہ نیلا آسماں
کتنا پیارا ہے یہ نیلا آسماں

بے ستون و بے سہارا ہے کھڑا
ہے مطیعِ حکمِ حاکم آسماں

آسماں تک کوئی بھی پہنچا نہیں
اتنی ہے تیری بلندی آسماں

جب نبیؐ میرے گئے معراج میں
کھل گیا ان کے لیے در آسماں

آسماں بھی رب کی اک تخلیق ہے
آسماں بھی رب کی قدرت کا نشاں

ہے یہی جاوید کی لب پہ دعا
امن کا گہوارہ بن جائے جہاں

■

Dr. Jawed Abdul Aziz
G-51/8, IIIrd Floor
Shaheen Bagh
New Delhi - 110025

ہم تمھیں مان لیں گے

بچو! آؤ مرے پاس آؤ
ساتھ اپنی کتابیں بھی لاؤ

آج کیا کیا ہے سیکھا؟ بتاؤ
ہم کو اپنا سبق تو سناؤ

جو کہوگے وہ ہم لا کے دیں گے
پہلے پڑھ لکھ کے سب کو بتاؤ

پڑھ لیا، لکھ لیا، ہو مبارک
جاؤ میداں میں اب کھیل آؤ

ہم بہادر تمھیں مان لیں گے
اپنا غصہ تو پی کر دکھاؤ

منہ جو کھولو، سدا سچ ہی بولو
جھوٹ اپنی زباں پر نہ لاؤ

تم بڑے ہو یہ تسلیم ہوگا
اپنی گردن ذرا تو جھکاؤ

تم سخی ہو یہ کیوں مان لیں ہم
اپنا لقمہ کسی کو کھلاؤ

اچھا بچہ نہ کیوں ہم کہیں گے
اچھا بچہ تو بن کر دکھاؤ

■

Mohd Rafey Shad Azmi
Jamia Islamia, Muzaffarpur
Azamgarh - 276302 (UP)

اسد رضا

بچی دل کی سچی

12 سالہ مریم کو اپنے پاپا جب یاد آتے تو اس کی آنکھیں بھر آتیں۔ پاپا کتنا پیار کرتے تھے! جب بھی اپنی پرائیویٹ نوکری سے واپس گھر آتے تو مریم کو گود میں لے کر خوب پیار کرتے او راچھالتے۔ اگر چہ وہ ایک لالہ کی دکان پر حساب کتاب دیکھتے تھے اور تنخواہ بھی معمولی تھی لیکن وہ ہر ماہ اپنی اکلوتی بیٹی مریم کے لیے کوئی چیز ضرور لاتے۔ موسم کے سستے پھل بھی لے آتے۔ کم آمدنی کے باوجود ایک مشن اسکول میں انھوں نے مریم کا داخلہ کرادیا تھا۔ دن ہنسی خوشی گزر رہے تھے۔ ایک دن اس کے پاپا اپنی سائیکل سے گھر واپس آرہے تھے کہ کوئی تیز رفتار ٹرک انھیں کچلتا ہوا چلا گیا۔ تب مریم چھٹی کلاس میں تھی۔ وہ یتیم ہوگئی۔ اس کی امی بی اے، بی ایڈ ضرور تھیں لیکن وہ گھر ہی سنبھالتی اور خالی وقت میں کپڑے سی کر کچھ کمالیتی تھیں کیونکہ کوشش کے باوجود انھیں نوکری نہیں ملی۔ شوہر کے انتقال کے بعد گھر چلانے کے لیے انھوں نے کپڑے سینے کے علاوہ چھوٹے بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھانا شروع کردیا تھا، لیکن مریم کی فیس ادا کرنے میں انھیں بہت پریشانی ہوتی۔ وہ نوکری کی تلاش میں مریم کے اسکول کی پرنسپل سے بھی ملیں لیکن مایوسی کے علاوہ کچھ نہ ملا۔ مریم کو احساس تھا کہ امّی کو گھر چلانے کے لیے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ لہٰذا وہ ان سے کسی چیز کی فرمائش نہ کرتی بلکہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے گھر میں جھاڑو لگاتی، برتن دھودیتی اور دھوپ میں کپڑے سکھانے کے لیے ڈال دیتی۔ اگر چہ امّی اسے یہ کام کرنے سے روکتی تھیں لیکن وہ انھیں سمجھاتی ''امّی جان! آپ ہر وقت کام کرتی ہیں، آرام بالکل نہیں کرتیں۔ اس لیے پلیز مجھے بھی تھوڑا سا کام کرنے دیجیے۔'' یہ سن کر امّی خاموش تو ہوجاتیں لیکن ان کی آنکھیں ضرور بھیگ جاتیں۔

مریم اپنی امّی سے ہی تھوڑا بہت پڑھ لیتی کیونکہ کسی ٹیچر سے ٹیوشن پڑھنے کے لیے تو گھر میں پیسے ہی نہیں تھے۔ مگر خود سے محنت کر کے وہ اپنی کلاس میں تعلیم کے لحاظ سے سب سے اچھی طالبہ بن گئی تھی۔ سب استانیاں اس کی تعریف کرتیں۔ کلاس کی ہر لڑکی اپنی سالگرہ دھوم دھام سے مناتی، پوری کلاس میں کیک، ٹافیاں اور چاکلیٹ تقسیم کرتی اور ٹیچرس کو بھی تحفے دیتی لیکن مریم یہ سب نہیں کر پاتی تھی کیونکہ وہ ایک یتیم اور غریب بچی تھی۔ اس کی ہم جماعت لڑکیاں کبھی دریافت کرتیں ''تم اپنا برتھ ڈے کیوں نہیں مناتیں؟ یہ سن کر وہ چپ ہو جاتی اور سوچتی 'کاش! اس کے پاپا حادثے میں نہ مارے گئے ہوتے تو وہ ضرور اپنی سالگرہ پر کلاس میں ٹافیاں ضرور تقسیم کرتی۔'' دراصل اس کے پاپا مریم کی سالگرہ پر چھوٹا سا کیک اور کچھ ٹافیاں ضرور لایا کرتے تھے۔ اور یہ سب سوچتے سوچتے اس کا دل بھر آتا۔

مریم ساتویں کلاس میں تھی۔ جب انٹرول میں سب لڑکیاں کھاتی پیتی، کھیلتی کودتی اور شرارتیں کرتی تھیں تب وہ لائبریری میں بیٹھ کر اپنا سبق دوہراتی۔ اسی لگن اور محنت کی وجہ سے وہ اپنی کلاس کے ہر امتحان میں چاہے وہ ششماہی ہو یا سالانہ، فرسٹ آتی تھی۔ وہ ہمیشہ خود بھی صاف ستھری رہتی اور اپنے بستے اور سیٹ کو بھی صاف ستھرا رکھتی۔ اسی طرح اس کا برتاؤ بھی نرم تھا۔ وہ کسی سے نہ تو لڑتی جھگڑتی اور نہ ہی جھوٹ بولتی تھی۔ ایک دن اس کی کلاس ٹیچر نے جو عیسائی تھیں، مریم کی تعریف کرتے ہوئے کلاس میں بتلایا کہ ''حضرت عیسیٰؑ کی والدۂ گرامی کا نام بھی مریم تھا اور وہ ایک عظیم خاتون تھیں، ہمیشہ سچ بولتی تھیں اور کبھی اپنی بات یا عمل سے کسی کا دل نہیں دکھاتی تھیں بلکہ ضرورت مندوں کی مدد کرتی تھیں۔ انگریزی میں مریم کو میری Maryy کہتے ہیں اور ہمارے اسکول کا نام انھیں کے نام پر سینٹ میری اسکول ہے۔'' یہ سن کر مریم بہت خوش ہوئی تھی۔ امّی جان نے ہی اسے بتلایا تھا کہ اپنی بچی کا نام پاپا نے خود ہی مریم زہرا رکھا تھا کیونکہ مریم جہاں حضرت عیسیٰؑ کی والدہ کا نام تھا وہیں زہرا رسول اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی دختر نیک اختر کا نام نامی تھا اور وہ فاطمہ زہرا کہلاتی ہیں اور یہ کہ حضرت فاطمہ زہرا کا بھی دنیا کی بہترین خواتین میں شمار ہوتا ہے۔

مریم کی امّی نے اپنے شوہر کے سامنے ہی اگنو سے بی ایڈ کر لیا تھا لیکن سفارش نہ ہونے اور عام خاندان سے تعلق ہونے کی وجہ سے انھیں استانی کی نوکری نہیں مل پائی تھی۔ البتہ وہ بچوں کو بڑی محنت اور محبت سے ٹیوشن پڑھاتی تھیں اور محلے کے کچھ خاندان اپنے بچوں کو مریم کی والدہ سے ہی ٹیوشن پڑھواتے تھے۔ جب اس کی امّی جان دوسرے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی تھیں تب مریم بھی ان بچوں کے ساتھ پڑھنے بیٹھ جاتی تھی۔ لیکن ایک دن عجب اتفاق ہوا۔ اسکول کی پرنسپل مسز جونسن بینک سے پچاس ہزار روپے نکال کر اسکول میں آئیں۔ ان کے پیچھے مریم لائبریری کتاب لینے جا رہی تھی۔ اچانک پرنسپل صاحبہ کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ انھوں نے بیگ میں سے موبائل نکالا تو اس کے ساتھ ہی دو دو ہزار کے 25 نوٹوں سے بھرا ہوا ان کا پرس زمین پر گر گیا لیکن اس کا علم انھیں نہیں ہوا۔ وہ آگے بڑھ گئیں اور اپنے چیمبر میں چلی گئیں۔ مریم نے زمین پر پڑا ہوا پرس دیکھ لیا تھا۔ مریم نے پرنسپل صاحبہ کو آواز بھی دی تھی لیکن شاید انھوں نے سنا نہیں تھا۔ اس لیے اس نے پرس اٹھایا جس میں سے نوٹ جھانک رہے تھے۔ کوئی بے ایمان ہوتا تو وہ پرس اپنے پاس رکھ لیتا لیکن مریم

چونکہ ایک سچی بچی تھی۔ لہٰذا وہ پرس اٹھا کر سیدھی پرنسپل کے کمرے کے سامنے آئی اور اندر داخل ہونے کی اجازت لے کر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے انھیں 'گڈ مارننگ' کی اور پرس ان کی میز پر رکھتے ہوئے کہا ''میڈم آپ کا یہ پرس باہر گر گیا تھا۔''

پرنسپل نے پرس اٹھاتے ہوئے کہا ''سچی اور اچھی لڑکی تمہارا تھینکس۔ معلوم ہے کہ پرس میں پچاس ہزار سے زیادہ روپے ہیں۔'' یہ کہہ کر انھوں نے پرس میں سے دو دو ہزار کے دو نوٹ نکالے اور انھیں مریم کو دینے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا Honest (ایماندار) گرل۔ یہ تمہارا ایوارڈ ہے۔''

No madam Thanks (نہیں میڈم شکریہ) میں نے تو اپنی ڈیوٹی پوری کی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر جانے کے لیے جیسے ہی مڑی ویسے ہی اس کی کلاس ٹیچر کمرے کے اندر آ گئیں۔ پرنسپل صاحبہ نے فوراً کہا ''میں اس لڑکی کو چار ہزار روپے انعام میں دے رہی ہوں کیونکہ اس نے میرا باہر گرا ہوا پرس ایمانداری سے لوٹا دیا۔ پرس میں 50 ہزار سے زیادہ کی رقم تھی۔ مگر یہ ایوارڈ نہیں لے رہی ہے۔''

''میڈم! مریم کا گھرانہ غریب ہے لیکن یہ بہت Honest ہے۔ اس کی ماں Widow (بیوہ) ہے۔ بی اے، بی ایڈ ہونے کے باوجود کہیں Teaching کی نوکری نہیں ملی۔ بے چاری کپڑے سی کر اور ٹیوشن پڑھا کر مریم کو ایجوکیشن دلا رہی ہے۔''

''اوہو! Good Girl میرے پاس آؤ۔'' پرنسپل نے مریم کو اپنے پاس بلا کر سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا God Bless You (تم پر اللہ کی رحمت ہو) کل اپنی مدر کو اسکول لے کر آنا وہ اپنے سرٹیفکیٹس اور ڈگریاں لے کر آئیں۔''

''تھینکس میڈم'' مریم نے سر جھکا کر کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

گھر جا کر جب مریم نے سارا واقعہ اپنی امّی کو بتلایا اور پرنسپل کے ذریعہ انھیں اسکول میں ملازمت دیے جانے کا عندیہ ظاہر کیا تو اس کی امّی نے فوراً اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ نوکری ملنے کی بات سن کر ان کی آنکھیں چھلک آئیں اور بھرّائی ہوئی آواز میں انھوں نے مریم کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ''میری بچی دل کی سچی! تیری ایمانداری اور نیکی نے ہمارے دن پھیر دیے۔ امید ہے کہ پرنسپل صاحبہ مجھے ضرور اپنے یہاں ٹیچر رکھیں گے۔ ہمارے اچھے دن آ جائیں گے۔ بیٹی! میں تمہیں خوب پڑھاؤں گی۔ اب تمہیں گھر کا کام نہیں کرنا پڑے گا بلکہ ساری توجہ اپنی تعلیم پر دے سکو گی۔''

''امی جان! کاش آج پاپا زندہ ہوتے تو کتنے خوش ہوتے'' مریم کی یہ بات سن کر امی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ''میری لاڈلی! تمہارے پاپا کی روح تمہاری ایمانداری سے ضرور مسرور ہوگی۔ کیونکہ وہ خود ایماندار تھے اور ہمیشہ کہا کرتے تھے ''سچے کا بول بالا جھوٹے کا منہ کالا۔''

''امی جان! اسی لیے تو کبیر داس نے بھی کہا ہے کہ

'سانچ برابر تپ نہیں جھوٹ برابر پاپ''

یہ سن کر مریم کی امّی نے ایک بار پھر اُسے گلے لگاتے ہوئے کہا ''بچّی دل کی سچی!'' مریم کی آنکھیں سچائی اور نیکی کے نور سے چمک رہی تھیں۔

■

Asad Raza
97-F, Sector-7, Jasola Vihar
New Delhi - 110025

افتخار انیس حمیدی

گم شدہ گڈّی

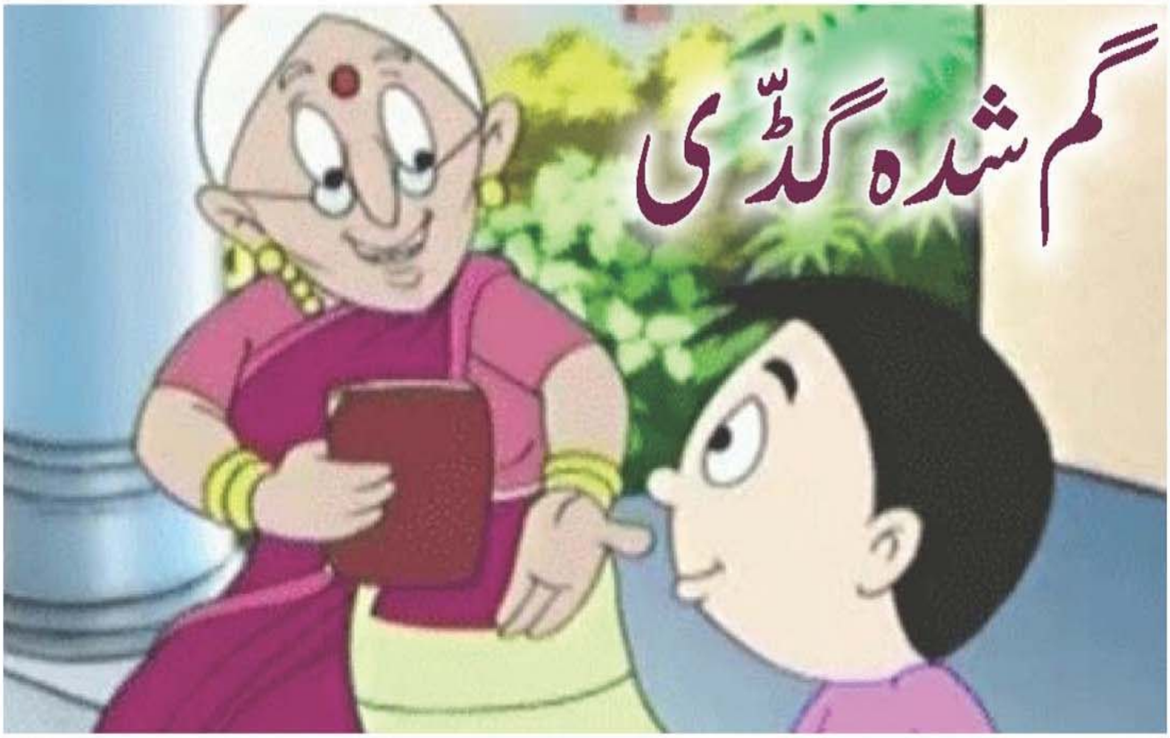

دادی اور امی کی کھس پھساہٹ سے دانش کو سنائی دیا کہ گھر میں سے دادی کی 'گڈی' کہیں غائب ہوگئی۔ آپا پوچھ رہی تھیں ''آخری بار آپ نے گڈی کب دیکھی تھی؟'' امی نے کہا ''گھر کے اندر کون آیا تھا؟ کب آیا تھا؟ جو گڈی لے گیا'' بھائی جان بولے ''آپ کو کس پر شک ہے؟'' دادی جھلا کر بولیں ''تم سب تو پولس کی طرح پوچھ تاچھ کر رہے ہو''۔ ''ایسے کیسے غائب ہو جائے گی۔'' آپا پھر بولیں ''گڈی کے کیا پر لگ گئے؟ سب کو مل کر اچھی طرح گھر میں تلاش شروع کرنی چاہیے۔ امی نے کہتے ہوئے ایک سوال اور داغ دیا کچھ یاد ہے کہاں رکھی تھی؟'' ارے! میں تو اپنے صندوق میں ہی رکھتی ہوں، دادی نے جواب دیا۔ ''ہوسکتا ہے کہ آپ نے اپنے بستر کے نیچے رکھی ہوگی۔'' اس بار ''آپ نے کل دھوبی کو کپڑے دیے تھے شاید باہر ہی بھول گئی ہوگی۔'' امی نے یاد دلایا۔ ''نہیں! نہیں! اس کو تو پیسے میں نے جمال سے دلوائے تھے۔ دادی نے ابا کا نام لیتے ہوئے کہا۔

یہ قصہ 23 جون 1967 جمال صاحب کے گھر کا ہے۔ ان کے گھر میں ان کی والدہ قمر جہاں ان کی اہلیہ افروز بیگم، ان کا بڑا لڑکا اطہر، لڑکی فاطمہ اور چھوٹا بیٹا دانش اور ان کے گھر کی ملازمہ سلمہ ہے۔

دانش اطہر کو بھائی جان اور فاطمہ کو آپا کہتا ہے۔ دانش کے بھائی جان ابنِ صفی کے جاسوسی ناول بہت شوق سے پڑھتے ہیں اور اپنے آپ کو جاسوس علی عمران سے کم نہیں سمجھتے۔ آج جاسوسی کا اچھا موقع مل گیا۔ دادی کی گم شدہ گڈی کی تلاش کی جائے۔ اس لیے انھوں نے اپنی بہن فاطمہ اور بھائی دانش کے ساتھ ایک جاسوسی ٹیم بنائی اور لگ گئے گمشدہ گڈی کا راز

جاننے کے لیے۔

''گڈی میں کتنے روپے تھے؟'' بھائی جان نے ایک بار پھر جاسوسی کے انداز میں دادی سے پوچھا۔ ''ایک ہزار روپے کی گڈی تھی'' دادی نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

''ہر مجرم جرم کرنے کے بعد کوئی نہ کوئی ثبوت ضرور چھوڑ جاتا ہے۔ بھائی جان نے بڑے پُر اسرار انداز میں اپنی ٹیم کو بتایا اور وہ تینوں اُس ثبوت کی تلاش میں جٹ گئے۔ تلاش سب سے پہلے گھر کے اُس کمرے سے شروع کی گئی جہاں دادی کا پلنگ بچھا تھا۔ دادی کے ہوادار کشادہ کمرے میں سامنے والی دیوار میں الماری اور اس سے لگا ہوا دادی کا پلنگ تھا، اس کے قریب سنگار میز، اسٹول، اسٹول پر پانی سے بھرا ہوا جگ، ایک شیشے کا گلاس رکھا رہتا ہے۔ کمرے کے ساتھ میں کوٹھری ہے جہاں دادی کا ایک صندوق رکھا ہے۔

''دادی صندوق کے علاوہ اپنے بستر کے نیچے، سنگار میز کی درازوں میں یا پھر الماری کے خانوں کے اخبار کے نیچے اپنے روپے پیسے رکھتی ہیں۔ بھائی جان نے جاسوسی انداز میں اپنی ٹیم کو سمجھایا۔

دادی، ابا اور امی کی دوسری ٹیم اپنے طریقے سے گمشدہ گڈی کی تلاش کر رہی تھی۔ ابا کا شک دانش پر تھا۔ شک کی وجہ تھی اُس کی لائبریری۔ دانش نے اپنے گھر میں ایک چھوٹی سی لائبریری قائم کر رکھی تھی جس میں وہ اپنے سبھی ملنے والوں سے کتابیں مانگ کر یا اپنے جیب خرچ سے کتابیں خرید کر جمع کرتا تھا۔ کل ہی وہ 70/روپے کی رڈی کتابیں اپنی لائبریری کے لیے خرید کر لایا تھا۔

امی نے دانش سے اپنے طریقے سے معلوم کیا تو اُس نے صاف منع کر دیا۔

دادی کا شک امینہ بی پر تھا، امینہ بی اکثر اپنی غریبی کا رونا روکر دادی سے پیسے مانگ کر لے جاتی تھیں۔ ہوئے تو واپس نہ ہوئے تو ہضم۔ مگر دادی نے اپنا شک کسی پر ظاہر نہیں کیا۔ بس وہ رہ رہ کر سوچ رہی تھیں آخر گڈی گھر میں سے کون لے گیا؟ کئی دن تک گم شدہ گڈی کی تلاش جاری رہی تلاش ہر بار دادی کے پلنگ، پاس کی الماری اور سنگار میز کے اردگرد ہی رہی۔

''بات روپیوں کی نہیں تھی فکر تھی تو ''چور'' کی، آخر چور ہے کون؟ جو دن دہاڑے گھر کے اندر سے آکر گڈی اُڑا لے گیا۔ اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ یہ تو کوئی شاطر چور معلوم ہوتا ہے۔ آج روپے گئے ہیں کل کو کوئی بھی قیمتی چیز- برتن، زیور..... کچھ بھی آنکھوں میں دھول جھونک کر لے جائے گا اور ہم سب ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔'' بھائی جان اس واقعہ کو اور بھی پُر اسرار بنا رہے تھے، فاطمہ اور دانش ان کی باتوں کو بڑے غور سے سن رہے تھے۔

ان تینوں کو چور کی تلاش تھی۔ رہ رہ کر ایک ہی سوال ہر دماغ میں گھوم رہا تھا۔ آخر گڈی کہاں گئی اور اس کا چور کون ہے۔ دو تین دن میں یہ بات پاس پڑوس میں بھی پھیل گئی پھر تو سبھی پڑوسی اپنے اپنے طریقے سے سوچنے لگے اور اپنی قیمتی رائیں دینے لگے۔ امینہ بی نے گمشدہ گڈی کے لئے تو فال بھی کھلوائی تھی؟ جس سے پتہ چلا تھا کہ گڈی اور چور گھر میں ہی ہے۔ پھر تو سبھی کا اندیشہ سلمہ پر ہوا۔ سلمہ کو دن بھر گھر کے کاموں سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے جو وہ گھر سے باہر جائے اور چوری کرے گی بھی کیوں اس کی سب ضرورتیں تو ہم ہی پوری کر دیتے ہیں۔ امی نے دادی کو تسلی دی۔

بھائی جان کی بھرپور کوششوں کے باوجود گمشدہ گڈی اور اس کا چور ہاتھ نہیں آ رہا تھا اور اس کا چھوڑا ہوا کوئی سُراغ بھی نہیں مل رہا تھا۔ آدھی رات ہو چکی تھی یہ تینوں لیٹے ہوئے چور کے بارے میں باتیں کر رہے تھے تبھی بھائی جان کو دادی کی سائڈ والی دیوار پر سایہ نظر آیا۔ کچھ دیر اُس سائے کو غور سے دیکھتے رہے۔ دیکھتے دیکھتے سایہ آہستہ آہستہ سنگار میز کے نیچے کہیں غائب ہو گیا۔ بھائی جان نے اُٹھ کر بجلی جلا دی اور دوڑ کر سنگار میز کے قریب پہنچ گئے۔ میز کے نیچے غور سے دیکھا مگر کچھ نظر نہیں آیا۔ بجلی بجھا کر واپس اپنے بستر پر لیٹ گئے مگر رات بھر بے چین رہے اور اس سائے کے بارے میں سوچتے رہے۔

صبح کو ایک بار پھر ان کی تلاش اُسی جگہ سے شروع ہوئی جہاں رات کو سایہ نظر آیا تھا۔ انھوں نے دادی کی سنگار میز ہٹائی، اور نیچے غور سے دیکھا ایک دم چلا پڑے ''چور پکڑا گیا!'' ''کہاں؟'' دانش اور فاطمہ جو ان کے ساتھ ہی تھے بولے۔ ''ادھر'' چوہے کا بل دکھا کر بھائی جان بولے اس بل میں۔ دانش بولا ''چوہے کا بل'' بھائی جان بولے ''ہاں'' بھائی جان نے چوہے کے بل کو کرید کر نوٹوں کی کترن نکال کر رکھاتے ہوئے کہا: یہ رہا ثبوت ''گمشدہ گڈی کا'' سبھی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور حیرت سے بولے تو چور چوہا تھا—

■

Iftekhar Anees Hameedi
196, Chilla
Amroha - 244221 (UP)

محمد ارشد خان

رؤف بازیگر

اس بار میں نے سوچ رکھا تھا کہ پوری چھٹی نانی کے گھر موج مستی میں بتاؤں گا۔ پر قسمت کی ایسی مار کہ وہاں جاتے ہی بیمار پڑ گیا۔ بیمار بھی ایسا کہ پورا مہینہ بستر پر گزرا۔ حکیم صاحب نے بتایا کہ میعادی بخار ہے۔ حکیم یعنی ہمارے نانا صاحب۔ حالانکہ ان کا نام مولوی حبیب الرحمٰن تھا، پر گاؤں جوار کے لوگ انھیں حکیم صاحب ہی کہا کرتے تھے اور یہ نام ایسا چل پڑا تھا کہ وہ ہم لوگوں کے لیے بھی حکیم صاحب ہی ہو گئے تھے۔

حکیمی ان کا پیشہ نہیں تھی۔ یہ کام وہ شوقیہ ہی کرتے تھے۔ شوق بھی ایسا کہ کسی کی بیماری سن لیں تو پھر رات دن کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ جڑی بوٹیاں تلاش کرنا، ان کی کٹائی پسائی کرنا اور دوائی بنانے میں دن کے دن لگ جاتے، روپے خرچ ہوتے پر مجال کہ کسی سے ایک پیسہ بھی لے لیں۔ حالانکہ لوگ ٹھیک ہوتے تو سوغات لے کر آتے۔ پر نانا محبت کے ساتھ انھیں منع کر دیتے۔

میری چارپائی امی کے پاس زنان خانے میں لگا دی گئی۔ میں دن بھر وہیں پڑا رہتا۔ مامیاں افسوس جتاتے ہوئے کہتیں ”کیسا ظلم ہوا ہے معصوم پر، کہاں تو ایک پل گھر میں قدم نہ ٹکتے تھے اور کہاں بے چارا بے بس پڑا ہوا ہے۔“

بات صحیح تھی۔ میرا پورا دن بھاگ دوڑ اور شیطانیوں میں گزرتا تھا۔ اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے ادھر بے مقصد اچھل کود اور اُدھم بازی، مار پڑی تو معصوم بن گئے اور نظریں بچیں تو پھر دھماچوکڑی شروع۔

اب تو دن بھر بستر پر پڑے پڑے میں ادب جاتا۔ لگتا دنیا سے کٹا ہوا ہوں۔ زنان خانے میں گھر کے مرد بے موقع کم ہی آیا کرتے۔ آتے بھی تو کھانس کھکار کر۔ نانا تو اندر بہت کم ہی آتے تھے۔ ضرورت ہوئی تو آئے اور فوراً ہی واپس ہو لیے۔ پر جب نانا اندر آتے تو ہلچل مچ جاتی۔ انگلیوں سے کپڑے ہٹا لیے جاتے۔ کوڑے کی ٹوکری پیڑ کی اوٹ میں

کردی جاتی۔ جہاں کہیں بھی پھول پتیاں بکھری ہوتیں ان پر فوراً جھاڑو چلنے لگتی۔ سب کے سر پر دوپٹے کھنچ جاتے۔ پورا ماحول ایک انوکھے نظم وضبط میں بندھ جاتا۔

بہوئیں اوٹ میں ہوکر نانی سے سلام پہنچانے کا اشارہ کرتیں۔ نانی ہنس کر کہتیں ''حکیم صاحب ان لوگوں کی بھی سن لیجیے۔ بڑی، منجھلی، چھوٹیا سب آپ کو سلام کہہ رہی ہیں۔''

''خوش رہو، جیتی رہو، سلامت رہو...'' اور نانا کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ وہ تھوڑی دیر بیٹھتے، سب کا حال چال معلوم کرتے اور نانی کے ہاتھ سے ایک گلاس پانی پی کر واپس چلے جاتے۔

اندر زنان خانے میں پڑا پڑا میں اوبتا رہتا۔ یہ تو بھلا ہو سدو کا کہ وہ شام کو پاس بیٹھ کر دن بھر کی کہانی سنا جاتا۔ سدو میرا ماموں زاد بھائی تھا۔ حالانکہ محمود اور سراج اور اچھن سے بھی خوب پٹتی تھی۔ پر اب وہ بڑے ہوگئے تھے اور ادھر کم آتے تھے۔ سدو چھوٹا تھا اس لیے دن بھر اِدھر اُدھر کرتا رہتا۔ نانی کا تو وہ سب سے دلارا تھا۔

ایک دن وہ ڈھلتی ہوئی دوپہر میں میرے پاس آیا۔ گرمی سے تپ کر اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ہونٹوں کے اوپر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں جمی ہوئی تھیں اور کرتا گیلا ہوکر بدن سے چپک گیا تھا۔

وہ بے وقت ملنے کبھی نہیں آتا تھا۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ گرمی کی اونگھ بھری دوپہری میں اس کا آنا برا بھی لگا۔ میں نے پوچھا ''سدو اس وقت کیسے؟''

سدو پائینتانے بیٹھ گیا۔ اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ پر جانے کس ناراضگی میں اور کس کو کہا ''کم بخت۔''

''کیا ہوا؟ کس پر گرمی اتار رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے وہی... جانے جن ہے کہ بھوت۔ پتلے پتلے پیڑ پر سرسراتے ہوئے ایسا چڑھتا ہے بندر کیا چڑھے گا۔ تمھیں تو پتا ہے کہ توتا پری کتنا سیدھا اور لمبا ہے؟''

''ہاں، مگر کون؟''

''ارے وہی بدمعاش''

''سدو...!'' تبھی دوسرے کمرے سے بڑی مامی کی آواز گونجی۔ ''ایسی باتیں گندے بچے کرتے ہیں۔ باہر دھوپ ہے چلو لیٹ کر آرام کرو۔''

زنان خانے میں بڑی مامی کا بڑا رعب چلتا تھا۔ سدو ڈر کے مارے کمرے سے نکل بھاگا۔ مجھے کوئی راستہ نہ سوجھا تو ہڑبڑاہٹ میں آنکھیں بند کرلیں اور سونے کا ناٹک کرنے لگا۔

سدو میرے سامنے ایک پہیلی چھوڑ گیا۔ ان دنوں میں بستر پر پڑے پڑے بنا کسی شرارت کے دن گزارتا تھا۔ اس لیے چھوٹی سی بات بھی میرے لیے حیرت کا سبب بن گئی۔

شام کو سدو میرے پاس نہیں آیا۔ حالانکہ مجھے پوری امید تھی کہ وہ چاہے ایک منٹ کے لیے آئے پر آئے گا ضرور۔ لیکن اس نے جھلک تک نہیں دکھائی۔

صبح کے وقت میری چارپائی دلان میں کردی جاتی تھی۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے آڑو کے پیڑ پر بلبل کی اچھل کود دیکھ رہا تھا۔ تبھی سدو دکھائی پڑا وہ تیزی سے باہر کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ میں نے پکارا ''سدو...!''

سدّو لپک کر آیا اور ہانپتا ہوا بولا ''جا رہا ہوں۔ آج گلی ڈنڈے کا میدان بدا ہے، آج اسے ہرا کر آؤں گا۔''

اس سے پہلے کہ میں کوئی اور سوال کرتا، وہ کمان سے چھوٹا ہوا تیر ہو چکا تھا۔

''سدو دوپہر کو واپس آیا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ نگاہیں

جھکی ہوئی تھیں۔

میں نے پوچھا "کیا ہوا؟ کون جیتا؟"

"وہی، اور کون جیتے گا" مجھے اس سے نفرت ہو گئی ہے۔"

سدو کا چہرا غصے سے لال ہو رہا تھا۔

"وہ کون...؟" میں جھلایا

"رؤف، جبار چچا کا لڑکا۔ جانے اس کے پاس کون سا منتر ہے کبھی ہارتا ہی نہیں۔"

"اچھن بھائی کو ساتھ لے گئے ہوتے۔"

"وہ بھی گئے تھے، اور محمود بھائی جان بھی۔ پر اس نے سب کو ہرا دیا۔

"اچھا!" میرا منہ حیرت سے کھل گیا "وہ اتنا اچھا کھلاڑی ہے؟"

سدو نے جیسے میری بات نہیں سنی۔ وہ ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں اس وقت کیسا احساس تھا، بتا نہیں سکتا۔

آس پاس سناٹا دیکھ کر اس نے کمر میں لگا چاقو نکالا اور بڑبڑایا "میں اسے مار دوں گا۔"

اس کے ہاتھ میں آم کاٹنے والا چاقو دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی۔

"یہ تمھیں کہاں سے ملا؟" میں نے اسے ڈانٹنے کے انداز میں پوچھا۔

"گاؤں کے لوہار سے ڈھائی روپے کا لے کر آیا ہوں۔"

"بے وقوف، یہ کوئی طریقہ ہوا؟" میں نے کہا "یہ تو کمزور اور بے ایمان لوگوں کا ڈھنگ ہے۔ تمھیں اگر جیت حاصل کرنی ہے تو اسے ہرانا سیکھو۔ گلی ڈنڈے نہ سہی دوڑ لگا لو۔ تم تو بہت تیز دوڑتے ہو۔"

"وہ دوڑ میں بھی ہرا چکا ہے۔"

"تو..." میں سوچتے ہوئے بولا لمبی کود یا تیراکی؟

"اسے سب کچھ آتا ہے۔"

"باپ رے..." میرے منھ سے یکایک نکلا۔ میں سوچنے لگا کہ اس کے اندر ایسی کون سی خاصیت چھپی ہے جو وہ

کسی کھیل میں ہارتا ہی نہیں۔ اچھن بھائی تو خاصے مضبوط ہیں۔ انھیں بھلا کیسے ہرا دیتا ہے۔ اس کا مطلب وہ طاقت ور اور لمبا چوڑا ہے۔

اس بیچ سدو اپنا چاقو پلنگ پر چھوڑ کر کب چلا گیا پتا ہی نہ چلا۔ میں دن بھر اسی لڑکے کے بارے میں سوچتا رہا۔

اگلی صبح سراج بھائی حال پوچھنے آئے تو میں نے اس لڑکے کے بارے میں پوچھا۔

''وہ تو جادوگر ہے'' وہ اس کی تعریف کرتے ہوئے کہنے لگے ''تم ٹھیک ہو جاؤ تو اس سے ملواؤں گا۔ اس سے مل کر تمھیں اچھا لگے گا۔ ایسا کون سا کام ہے جو وہ نہ کر پاتا ہو۔ سچ مچ حیرت ہوتی ہے پرسوں چچا کو سائیکل ریس میں ہرا دیا۔''

میں سنتا رہا اور اس کے بارے میں طرح طرح کے تصورات میں کھو گیا۔

کچھ دنوں بعد کی بات ہے میں تھوڑا تھوڑا ٹھیک ہونے لگا تھا۔ آنگن میں تھوڑا بہت ٹہل گھوم لیتا تھا۔

اچانک ایک صبح باہر بہت تیز شور سنائی دیا۔ اس چیخ پکار میں رونے کی آوازیں بھی شامل تھیں۔

مردان خانے کے سارے لوگ باہر لپکے۔ سدو ناشتہ چھوڑ کر تیر کی طرح باہر کی طرف دوڑا۔ میں بھی ہمت کر کے باہر نکلا۔ چبوترے پر کھڑے ہو کر دیکھا تو سامنے بنے کوئیں کی جگت پر بھیڑ لگی تھی۔ لوگ کنوئیں کے اندر جھکے جا رہے تھے۔ ''رسی لاؤ''، بالٹی لاؤ کا شور مچ رہا تھا۔ ایک طرف ماتھے پر گھونگھٹ کاڑھے عورتوں کا جھنڈ کھڑا۔ وہ چیخ پکار مچا رہی تھیں۔ کچھ رو رہی تھیں۔

اجو انکل بدحواسی سے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ ان کا دو سال کا بچہ کھیلتے کھیلتے کوئیں میں گر گیا تھا۔ اجو چیخ چیخ کر جان دیے جا رہا ہے۔ ایک بار تو خود کنوئیں میں کودنے کی کوشش پر لوگوں نے تھام لیا۔

تبھی رسی اور بالٹی آ گئی۔ پھر بھی کامیابی ملنے کی اُمید کم تھی کیونکہ بچہ چھوٹا تھا اور ڈر کے مارے نڈھال ہو چکا تھا۔

تبھی بھیڑ کو چیرتا ہوا ایک دبلا پتلا لڑکا آیا اور اس سے پہلے کوئی کچھ سمجھتا وہ کنوئیں میں کود پڑا۔ میں اسے ٹھیک سے دیکھ نہ پایا۔

بس اس کی مٹ میلی اور بدرنگ قمیض ہی نگاہ میں آئی۔ میں سوچتا رہ گیا کہ وہ جانباز کون ہے؟

تبھی شور اٹھا ''رؤف کنوئیں میں کود گیا۔''

میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ میں نے آنکھیں گڑا دیں۔ آج ہر حال میں میں اس لڑکے کو دیکھ لینا چاہتا تھا اور ذہن کی سارے وسوسوں کو مٹا ڈالنا چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر میں رسی کے سہارے ایک لڑکا کنوئیں سے اوپر آتا دکھا۔ لوگ چلائے ''بچہ بچ گیا۔ رؤف نے بچا لیا۔''

باہر آتے ہی لوگوں نے رؤف کو کاندھے پر اٹھا لیا۔ اسے دیکھ کر میری حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔ یقین نہ ہوا جو دیکھ رہا ہوں وہ سچ ہے یا جھوٹ، جسے میں لمبا چوڑا اور طاقتور سمجھ رہا تھا وہ اس سے بالکل الٹا تھا۔ چھوٹا قد کا دبلا پتلا، سانولا سا لڑکا۔

اور سب سے بڑی بات جس پر مجھے ہی نہیں کسی کو بھی حیرانی ہوتی۔ وہ یہ کہ اس کا ایک ہاتھ بازو کے پاس کٹا ہوا تھا۔ بازو بھلے ہی نہیں تھا لیکن رؤف بازی گر تھا۔

■

Dr. Mohd Arshad Khan
Asst. Prof. Dept of Hindi
G.F. College
Shahjahanpur - 242001 (UP)

سحر اسعد

اردو زباں ہماری

"دادا جان! دادا جان! چلیے ہم کیرم کھیلتے ہیں۔" عمیر دوڑتا ہوا دادا جان کے کمرے میں داخل ہوا۔

دادا جان کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ قریب ہی سائڈ ٹیبل پر رنگ برنگ سرورق والی کتاب رکھی ہوئی تھی۔ اشتیاق کے مارے اس نے وہ کتاب اٹھائی۔ 'بچوں کی دنیا' بڑے بڑے حروف میں سرورق پر لکھا ہوا تھا۔ لیکن چونکہ وہ ایک انگلش میڈیم اسکول سے تعلیم حاصل کر رہا تھا اس لیے اردو نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے رسالہ کھولا تو رنگ برنگ تصاویر کو دیکھ کر اس کو پڑھنے کا شوق دل میں جاگ اٹھا۔

"دادا جان! یہ والی کہانی مجھے پڑھ کر سنایئے نا۔" اس نے دادا جان کا گھٹنا ہلا کر کہا۔

"خود ہی پڑھ لو" دادا جان نے مختصر جواب دیا۔

"لیکن کیسے؟ مجھے تو اردو نہیں آتی۔" وہ ہاتھ ملتے ہوئے بے بسی سے بولا۔

دادا جان نے اپنے چشمے کو سیدھا کیا اور اس کو غور سے دیکھتے ہوئے بولے: "ہوں! کتنے افسوس کی بات ہے بیٹا! اردو تو ہم سب کی مادری زبان ہے۔ تم تو اردو زبان ہی میں بات کرتے ہو لیکن پڑھ نہیں سکتے؟ اتنا کہہ کر وہ تھوڑی دیر رکے اور پھر بولے: "دیکھو بیٹا اردو ایک نہایت میٹھی اور خوبصورت زبان ہے۔ اس میں بچوں کے لیے پیاری پیاری کہانیاں اور اچھی اچھی نظمیں ہوتی ہیں۔ یہ ہمارے ملک کی تہذیب کا ایک حصہ ہے۔ اس کو سیکھنا ہم سب کے لیے بے حد ضروری ہے۔"

دادا جان اسے نہایت شفقت سے سمجھا رہے تھے اور وہ بہت غور سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ وہ ضرور اس چاشنی سے لطف اندوز ہوگا، اس کو ضرور سیکھے گا۔

اگلے دن جب وہ اسکول سے لوٹ رہا تھا تبھی اس نے ایک جگہ ایک بورڈ لگا ہوا دیکھا۔ جس پر موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا: ''اردو سیکھیے'' یہ بورڈ بہت پہلے سے لگا ہوا تھا لیکن اس نے اس پر غور نہیں کیا تھا۔ آج اس بورڈ کو دیکھ کر وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ اور جلدی سے دوڑ کر اس سینٹر میں داخل ہوگیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک ٹیچر ایک بڑے سے کلاس میں بچوں کو اردو سکھلا رہے تھے۔ اس نے اندر جانے کی اجازت لی ، ادب سے سلام کیا اور اپنی خواہش بیان کی۔ انھوں نے نہایت شفقت سے اس کی بات سنی اور اس کی درخواست قبول کر لی۔ عمیر کو یہ جان کر بہت حیرت ہوئی کہ وہ بچوں سے فیس نہیں لیتے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد جب وہ گھر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کی امی پریشانی کے عالم میں برآمدے میں ٹہل رہی تھیں۔ اس کو دیکھتے ہی بولیں: ''بیٹا اتنی دیر کہاں لگا دی؟''

''امی! وہ دراصل میں........'' اس نے ایک ہی سانس میں پوری بات بتادی۔ اس کی امی بھی بہت خوش ہوئیں۔ ''لیکن امی! آپ یہ بات ابھی داداجان کو مت بتلایئے گا۔ میں جب اردو لکھنا اور پڑھنا سیکھ لوں گا تو داداجان کو سرپرائز دوں گا۔'' اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔'' امی جان نے سر ہلا کر ہامی بھر لی۔

چونکہ داداجان دوپہر میں تھوڑی دیر آرام کرتے تھے اس لیے انھیں عمیر کے دیر سے آنے کی خبر معلوم نہیں ہوسکی تھی۔ عمیر اب روزانہ اسکول سے واپسی پر پابندی سے اردو سینٹر جاتا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ اردو کے رسالے اور کہانیاں پڑھنے لگا تھا۔ تقریباً دو مہینے بعد اس کے ٹیچر نے اسے چھٹی دے دی۔ اور اسے تنبیہ کی کہ ''بیٹا! اردو بہت میٹھی زبان ہے۔ ہمیشہ اسے پڑھتے رہنا اور دوسروں کو بھی سکھانا، کبھی اس کو حقیر مت سمجھنا۔ یہ ہمارے ملک کی اہم زبان اور قیمتی وراثت ہے۔''

''ضرور، کیوں نہیں، میں اسے دوسروں کو بھی سکھلاؤں گا۔'' اس نے سر ہلایا۔

گھر آ کر اس نے نہایت جوش کے عالم میں اپنی امی کو اپنا رزلٹ دکھلایا۔ امی نے خوش ہو کر اسے دعائیں دیں۔ اور اس کے پاپا کو جو کہ بیرون ملک رہتے تھے فون کر کے اس خبر کی اطلاع دی۔ وہ بھی بہت خوش ہوئے۔ اور انہوں نے انعام کے طور پر عمیر کے لیے 'بچوں کی دنیا' اور اردو کے کچھ دوسرے رسالے جاری کرا دیے۔

شام کو جب داداجان اٹھے اور نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر لان میں بیٹھے تو عمیر 'بچوں کی دنیا' ہاتھ میں لیے ان کے پاس جا پہنچا اور فرفر پڑھ کر سنانے لگا۔ داداجان پہلے تو حیران ہوئے اور پھر انتہائی خوشی کے ساتھ اس کے ماتھے پر پیار سے بوسہ دیا۔

اور پھر عمیر اپنے پڑوس کے لڑکے کو جو اردو نہیں جانتا تھا اردو سکھلانے لگا۔

میری آپ سب سے ایک چھوٹی سے درخواست ہے کہ آپ اپنے محلے، پڑوس وغیرہ میں جو بھی بچہ اردو نہ جانتا ہو اسے اردو زبان ضرور سکھلایئے۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستان میں دھوم ہماری زباں کی ہے

■

Sahar Asad D/o Asad Aazmi
B-18/1 G. Jamia Salafia Marg
Reori Talab
Varanasi - 221010 (UP)

اطہر عبداللہ سوداگر ٹانڈوی

علم کا بین

شوق سے پڑھنے جاتا ہوں میں
کھیل سے جان چراتا ہوں میں
علم کا بین بجاتا ہوں میں
اچھا گیت سناتا ہوں میں
حمد خدا کی گاتا ہوں میں
شوق سے پڑھنے جاتا ہوں میں
علم کا بین بجاتا ہوں میں
مرغا بولے جب ککڑو کوں
کرتی ہے گوریا چوں چوں
بستر سے اٹھ جاتا ہوں
شوق سے پڑھنے جاتا ہوں
علم کا بین بجاتا ہوں میں
صبح سویرے چھوڑ کے بستر
ہاتھ پیر منھ اپنا دھو کر
قلم دوات اٹھاتا ہوں میں
شوق سے پڑھنے جاتا ہوں میں
علم کا بین بجاتا ہوں میں
امی ابو خوش ہوتے ہیں
بھیا بھی اچھا کہتے ہیں
گھر میں سب کو بھاتا ہوں میں
شوق سے پڑھنے جاتا ہوں میں
علم کا بین بجاتا ہوں میں
پڑھنے لکھنے میں عزت ہے
سیکھ لو اس کو یہ حسرت ہے
کھیلوں سے اب کتراتا ہوں میں
شوق سے پڑھنے جاتا ہوں میں
علم کا علم بین بجاتا ہوں میں
علم کی دولت خوب حسیں ہے
اس سے غفلت ٹھیک نہیں ہے
گیت یہی اب گاتا ہوں میں
شوق سے پڑھنے جاتا ہوں میں
علم کا بین بجاتا ہوں میں
اطہر دادا کی یہ باتیں
میٹھی میٹھی یہ سوغاتیں
روز انھیں سے پاتا ہوں میں
شوق سے پڑھنے جاتا ہوں میں
علم کا بین بجاتا ہوں میں

■

Athar Abdullah Saudagar Tandvi
Sakrawal Purab, Tanda
Ambedkar Nagar - 224190, Uttar Pradesh

پہلی قسط

طوطا کہانی

مصنف: محسن خان

مصور: فجرالدین

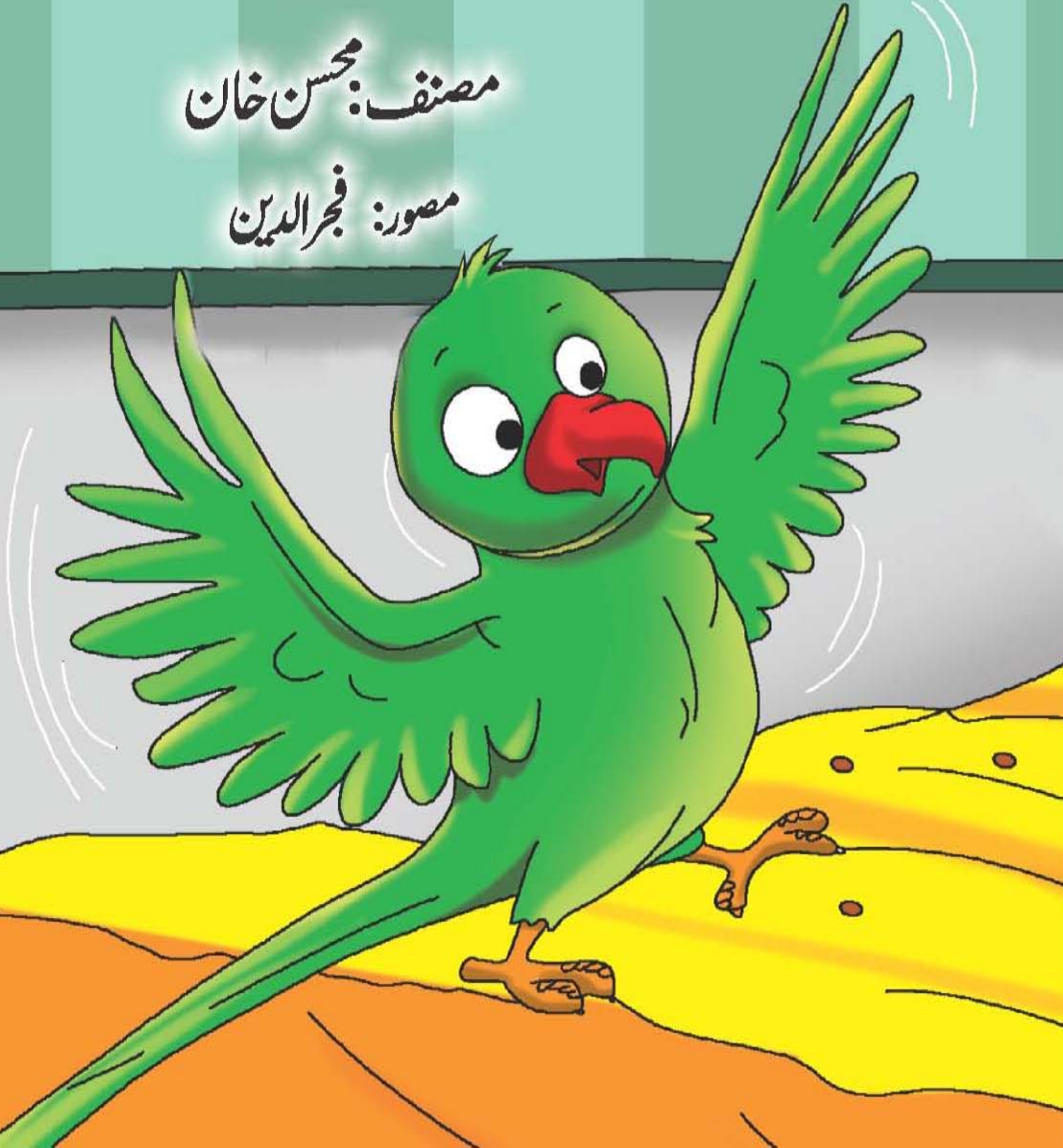

دانش جیسے ہی گھر میں داخل ہوا اس کی نظر طوطے پر پڑی۔ ایک بڑا سا پہاڑی طوطا لان میں امرود کے درخت پر آرام سے بیٹھا چونچ سے اپنے پر کھجا رہا تھا۔ دانش کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے کئی طرح کے طوطے دیکھے تھے مگر یہ طوطا ان سب طوطوں سے زیادہ خوبصورت اور بڑا تھا۔ اس کے پروں میں کئی رنگ تھے۔ چونچ سرخ تھی اور پنجے بھی لال تھے۔ اپنے گھر کے لان میں اتنا بڑا اور خوبصورت طوطا دیکھ کر دانش کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ سچ مچ کسی طوطے کو دیکھ رہا ہے یا کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ دبے قدموں سے طوطے کے قریب گیا۔ طوطے نے اس طرح اس کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو! فرمائیے، کیا بات ہے؟

دانش کو طوطے سے ذرا سا بھی ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ طوطا اپنی نیل کٹر سے بھی بڑی چونچ سے اس کی انگلی کاٹ لے گا۔ قریب جا کر اس نے طوطے کے سر پر آہستہ آہستہ انگلی پھیری۔ طوطے نے سر کو جھکا لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر تک سر سہلانے کے بعد دانش نے انگلی طوطے کے پنجوں کے پاس رکھی۔ طوطے نے پہلے ایک پنجہ دانش کی انگلی پر

رکھا پھر دوسرا پنجہ بھی اس کی انگلی پر رکھ دیا۔ انگلی پہ طوطے کو بٹھا کر دانش اتنا خوش ہوا جیسے وہ امتحان میں سب سے زیادہ نمبر لے آیا ہو۔ وہ دوڑتا ہوا گھر کے اندر گیا دانش کی ممی نے اس کی انگلی پر طوطا دیکھا تو پوچھا" یہ طوطا تم کہاں سے لے آئے"؟

لان میں امرود کے درخت پر بیٹھا تھا۔ دانش نے جواب دیا۔

"کسی کا پالتو معلوم ہوتا ہے۔ اسے اڑا دو، جہاں سے آیا ہے وہیں چلا جائے گا"۔ ممی نے کہا۔

"اڑاؤں گا نہیں میں اسے پالوں گا"، دانش نے کہا اور وہ طوطے کو لے کر دادی ماں کے کمرے میں گیا۔ دادی ماں موٹی سی چونچ والے بڑے سے طوطے کو دیکھ کر ایسی ڈریں کہ ایک طرف کو لڑھک گئیں۔ اگر انھیں دیوار کا سہارا نہ مل جاتا تو فرش پر ہی گر جاتیں۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر کچھ دیر تک طوطے کو دیکھتی رہیں پھر سنبھل کر بیٹھ گئیں اور انھوں نے دانش سے کہا "ائی اتنا بڑا۔ "کمبخت مارا طوطا ہے کہ الو"۔

دانش نے کہا" دادی ماں یہ الو نہیں طوطا ہے، پہاڑی طوطا"۔

دادی ماں نے اک بار پھر غور سے طوطے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ تمھاری انگلی پہ اس طرح بیٹھا ہے جیسے تمھیں پہچانتا ہو“۔

دادی ماں یہ میرے کاٹ بھی نہیں رہا ہے۔ اس نے کہا، یہ دیکھیے۔ دانش نے اپنی انگلی طوطے کی چونچ کے قریب کی تو طوطے نے چونچ کا رخ دوسری طرف کرلیا۔

”کسی کا پالتو ہے۔ یہ تم کو کہاں مل گیا“۔ دادی ماں نے پوچھا۔

لان میں امرود کے درخت پر بیٹھا اپنے پر کھجا رہا تھا۔ دانش نے جواب دیا۔

”کسی کے گھر سے اڑ کر آ گیا ہے۔ اس کا مالک اسے تلاش کرتا ہوا آتا ہی ہوگا“، دادی ماں نے کہا۔

”کسی کو نہیں دوں گا۔ اب یہ میرے پاس رہے گا“۔ دانش نے کہا۔

اس نے طوطے کو میز پر بٹھانے کی کوشش کی تو طوطے کے پنجے میز کے شیشے پر پھسل گئے اور اس کی چونچ کھٹ سے شیشے سے ٹکرا گئی۔ دانش نے جلدی سے طوطے کے پروں کو پکڑ کر اسے اٹھایا تو طوطا ٹیں ٹیں کر کے زور سے

چیخا اور غصہ سے اس کے سر کے بال ایسے پھول گئے جیسے اس نے کنٹوپ پہن لیا ہو۔ طوطے کی چیخ سن کر دانش کی ممی دوڑتی ہوئی آئیں اور طوطے کی طرف دیکھتے ہوئے انھوں نے دانش سے پوچھا۔ کیا ہوا، "طوطا کیوں چیخ رہا تھا"۔؟

"میں نے اس کے پر پکڑ لیے تھے اس لیے چیخ رہا تھا"۔ دانش نے جواب دیا۔

"اب تم اسے انگلی پر بٹھا کر گھومتے رہو گے یا کپڑے بھی بدلو گے"۔ ممی نے دانش سے کہا۔

ابھی بدلتا ہوں ممی۔ دانش نے کہا۔

اس نے طوطے کو دادی ماں کے بستر پر کنارے کی طرف بٹھایا اور کپڑے بدلنے کے لیے جانے لگا تو دادی ماں نے اس سے کہا، "اسے یہاں سے لے جاؤ نہیں تو میرے بستر پر گندگی کرے گا"۔

"دادی ماں ابھی آتا ہوں"۔ دانش نے کہا اور دوڑتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

(جاری)

مصنف: جولز ورنے
مترجم: شکیل صدیقی

قسط وار ناول

گیارھویں قسط

زمین کی تہہ میں

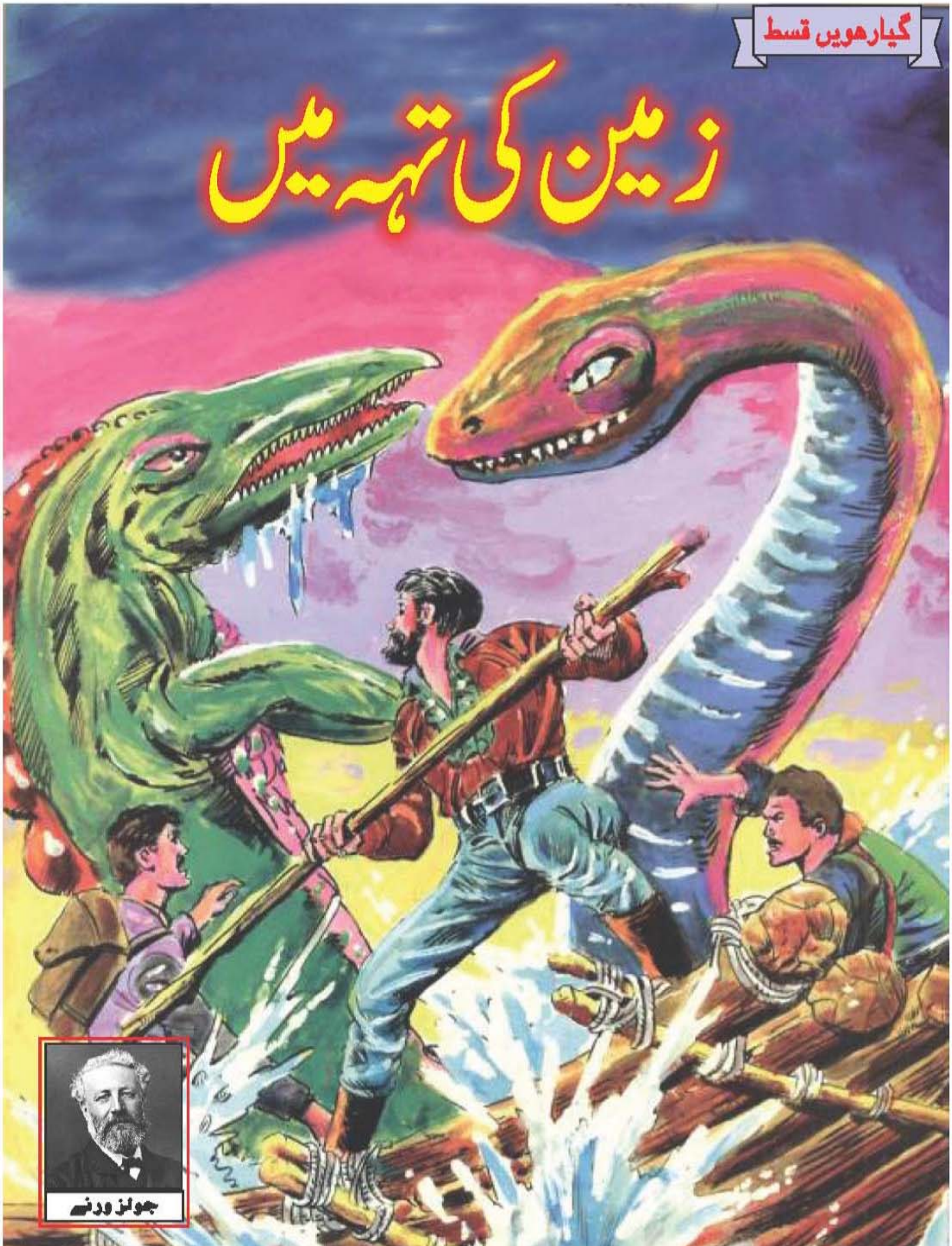

جولز ورنے کے ناول بچوں کے ساتھ بڑوں میں بھی بہت مقبول رہے ہیں۔انھیں نئے نئے جہانوں کی سیر کرنے اور کرانے میں ملکہ حاصل تھا۔ان کے ناولوں پر کئی فلمیں اور ٹیلی سیریل بھی بن چکے ہیں۔'زمین کی تہہ میں' ایک ایسا ناول ہے جس میں زمین کے ہزاروں فٹ نیچے کی دنیا کو دکھایا گیا ہے۔یہ پروفیسر لائڈین بروک کی کہانی ہے جو ایک پراسرار تحریر کے بعد زمین کی تہہ کے ایک سفر پر نکلتا ہے جس میں اُسے ڈھیر ساری مشکلات پیش آتی ہیں۔عجیب وغریب جانداروں اور اشیا سے اُس کا سامنا ہوتا ہے۔وہ کس طرح زمین کی تہہ تک پہنچتا ہے اور واپس اِس دنیا پر آتا ہے یہی اس ناول کا ماحصل ہے۔اس میں آپ کو سائنس کی اہم معلومات کے ساتھ ساتھ زمین کے اندر کی عجیب وغریب جانکاریاں بھی ملیں گی۔

اب تک آپ نے پڑھا کہ پروفیسر لائڈین بروک معدنیات وارضیات کے ماہر تھے۔وہ بہت قابل شخص تھے اور علاقے میں ان کی کافی عزت تھی۔ایک دن انھیں سات سو سال پرانی کتاب ہاتھ لگی جو آئس لینڈ کی زبان میں تھی۔پروفیسر بروک اپنے بھتیجے کے ساتھ رہتے تھے۔چچا بھتیجے نے اس کتاب کی تحریر سمجھنے کی کوشش کی۔بہت مشکل سے بس وہ کچھ الفاظ ہی سمجھ پائے۔پروفیسر لائیڈن بروک کہیں چلے جاتے ہیں اور ادھر بھتیجہ اس تحریر کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس میں کامیاب ہو جاتا ہے۔وہ نہیں چاہتے ہوئے بھی پروفیسر کو بتا دیتا ہے کیونکہ اس میں ایک خطرناک سفر پر جانے کی بات تھی۔تحریر کو پڑھنے اور سمجھنے کے بعد پروفیسر نے سفر پر جانے کی ٹھان لی۔بھتیجہ (البرٹ) نہیں چاہتے ہوئے بھی تیار ہو گیا۔

آخر کار دو دن بعد لائیڈن بروک اور البرٹ اِس خطرناک سفر پر نکل گئے۔سفر کے لیے انھیں کوپن ہیگن پہنچنا تھا اور وہاں سے آئس لینڈ۔آئس لینڈ پہنچنے کے بعد ایک رات آرام کیا اور پھر دوسرے دن صبح وہاں کے مشہور آتش فشاں سینی فلز کا سفر شروع کیا۔سینی فلز پانچ ہزار فٹ بلند پہاڑ تھا۔کئی طوفان اور دیگر پریشانیوں کا سامنا کرتے ہوئے چچا بھتیجے سینی فلز کی چوٹی پر پہنچتے ہیں۔چوٹی سے اب آتش فشاں کے اندر اترنے کا خطرناک سفر شروع ہوا۔دونوں لوگ سنبھل سنبھل کر زمین کی تہہ میں اترنے لگے۔کئی گھنٹوں کی مشقت کے بعد دونوں تقریباً دس ہزار فٹ نیچے پہنچتے ہیں جہاں انھیں ایک عجیب وغریب منظر دکھائی دیتا ہے۔آتش فشاں کے لاوے بکھرے پڑے تھے اور ان سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔وہاں سے آگے بڑھتے ہوئے دونوں ایک سرنگ میں داخل ہوئے اور سات گھنٹے کے سفر کے بعد وہ کھلی جگہ میں پہنچے جہاں پودوں اور جانوروں کے ڈھانچے موجود تھے۔

اب دونوں کے پاس پینے کا پانی بھی ختم ہونے والا تھا۔سفر ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا اور پریشانیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔چٹانوں سے گزرتے ہوئے وہ سب ایک سرنگ میں پہنچے۔سرنگ سے آگے انھیں کوئلے کی ایک کان ملتی ہے۔کان میں آگے راستہ بند تھا اس لیے واپس لوٹے، جب تک پینے کا پانی ختم ہو چکا تھا۔پروفیسر واپس جانے کو تیار نہیں تھے جبکہ البرٹ اور ہانس کو اپنی موت سامنے نظر آ رہی تھی۔کوئلے کی کان کے بعد تانبے اور ابرق کی کانوں سے گزرتے ہوئے دو دن اور بیت گئے۔سارے لوگ نڈھال ہو چکے تھے۔اس درمیان ایک دریا میں پانی بہنے کی آواز آتی ہے۔بڑی مشکل سے چٹان توڑ کر ہانس نے پانی پینا چاہا لیکن یہ دریا گرم پانی کا تھا۔بعد میں یہ پانی ٹھنڈا ہو گیا۔بعد میں البرٹ پروفیسر سے بچھڑ جاتا ہے اور گرینائٹ کی چٹانوں پر پہنچ جاتا ہے۔البرٹ کی لالٹین بھی بجھ چکی تھی اور گہرا اندھیرا تھا۔اچانک البرٹ نیچے گرنے لگتا ہے۔

جب البرٹ کو ہوش آتا ہے تو اسے دور سے چچا اور ہانس کی آواز آتی ہے جو اُسے ہی تلاش کر رہے تھے۔بہت مشکل سے البرٹ اپنے چچا تک پہنچتا ہے۔اس کے بعد سب لوگ دو دن آرام کرتے ہیں۔پروفیسر نے کہا کہ اب تیار ہو جاؤ، سمندری سفر پر چلنا ہے۔البرٹ گھبرا گیا کہ یہاں سمندر کہاں ہے۔پروفیسر بروک نے جواب دیا کہ بحیرۂ بروک ہے اس کا نام، کیونکہ اسے میں نے تلاش کیا ہے۔ہانس نے آس پاس کے درختوں کی لکڑیوں سے ایک بیڑا تیار کیا اور وہ سب لوگ اُس بیڑے میں بیٹھ کر اس عجیب وغریب سمندر میں اتر گئے جو زمین سے اٹھاسی میل نیچے تھا۔سمندر میں کچھ آگے جانے پر کنارہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔چچا بھتیجے نے مچھلی پکڑ کر بھوک مٹائی۔24 گھنٹے گزر چکے تھے۔لیکن دوسرا کنارہ اب تک نظر نہیں آیا تھا۔کچھ دیر بعد سمندر میں وھیل جیسا عجیب وغریب جانور دکھائی دیتا ہے پھر ایک دوسرا جانور پیلیسورس نظر آیا اور ان دونوں میں جنگ شروع ہو گئی۔یہ جنگ بیڑے کے قریب ہو رہی تھی۔لوگ دم سادھے یہ عجیب وغریب جنگ دیکھ رہے تھے۔سات دنوں کے بعد بیڑہ ایک جزیرے پر پہنچتا ہے۔وہ لوگ جزیرے پر کچھ وقت گزار کر پھر سے سمندری سفر پر روانہ ہو گئے۔اب آگے

طوفان

آج وہ گرم چشمے سے پھوٹنے والا فوارہ ہماری نظروں سے اوجھل ہوگیا، ہوا میں تیزی تھی اس نے ہمارے بیڑے کو جزیرہ البرٹ سے بہا کر آگے کر دیا۔

موسم تبدیل ہو رہا تھا، ہوا میں بھاری پن تھا اور بجلی کی چمک میں اضافہ ہوگیا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ جنوب کی طرف جو بادل تھے وہ یکجا ہوگئے اور تاریکی میں اضافہ ہونے لگا۔

وہاں اس وقت اتنی بجلی تھی کہ میرے سر کے بال کھڑے ہونا شروع ہوگئے۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میرا کوئی ساتھی مجھے چھولے گا تو اسے شدید جھٹکا لگے گا۔ صبح دس بجے کے قریب موسم انتہائی خراب ہوگیا۔ میں نے اس بارے میں پروفیسر کو بتایا تو انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کا موڈ خراب تھا اس لیے کہ سمندر ختم ہی نہیں ہونے میں آ رہا تھا اور وہ مسلسل ہماری طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ طوفان آنے والا ہے۔“ میں نے کہا۔

”انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور سکوت طاری رہا۔ ہوا بھی ساکت تھی۔ بیڑا تقریباً ٹھہر گیا تھا اور آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔“ میرا خیال ہے کہ بادبان ہٹا دینے چاہئیں تاکہ بیڑا آگے بڑھ سکے۔“ میں نے تجویز پیش کی۔

”نہیں سو بار بھی نہیں۔“ میرے چچا چیخے۔ ”ہوا کو موقع دو کہ وہ ہمیں بہا کر لے جائے۔ ممکن ہے اس طرح سے ہم کسی کنارے تک پہنچ جائیں۔ مجھے اس کی پروا نہیں کہ یہ ہوا بیڑے سے ٹکرا کر اس کے ٹکڑے کر ڈالے۔“

ابھی انھوں نے یہ جملہ ادا ہی کیا تھا کہ جنوبی افق پر تبدیلی رونما ہوئی۔ ہوا میں اچانک شدت اور تیزی پیدا ہوئی اور اس نے طوفان کی شکل اختیار کرلی۔ گہری تاریکی پھیل گئی اور میں اس بارے میں مختصر سا نوٹ ہی لکھ سکا۔

بیڑا ایک بار شدت سے فضا میں اچھلا اور پھر آگے کو گرا، اس کی وجہ سے چچا جھٹکے سے ایک طرف لڑھک گئے۔ میں گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا ان تک پہنچا تو میں نے انھیں ایک رسی پکڑے دیکھا، شاید وہ سمجھ رہے تھے اب وہ محفوظ ہوگئے ہیں۔ ہانس اپنی جگہ سے نہیں ہلا تھا۔ اس کا چہرہ پرسکون تھا اور سرخ بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ وہ وہاں اس طرح سے کھڑا ہوا تھا جیسے قبل از تاریخ کا کوئی انسان ہو۔

تیز ہوا بیڑے کو کتنی تیزی سے لیے جا رہی تھی، میں اس کا اندازہ نہیں لگا سکا۔ بیڑے کا مستول سیدھا کھڑا تھا جب کہ بیڑے کا حال اس بلبلے کی طرح سے تھا جو پھٹنے کے قریب ہوتا ہے۔

پھر تھوڑی دیر بعد بارش شروع ہوگئی۔ سمندر ابلنے لگا اور بادل پھٹنے لگے۔ بجلی کے جھماکے ہو رہے تھے اور اولے گر رہے تھے۔ یہ اولے جب ہماری بندوقوں اور دھاتی چیزوں سے ٹکراتے تھے تو عجیب سی آوازیں پیدا کرتے تھے۔ سمندر کی ہر لہر کے ساتھ آگ اور شعلوں کی آمیزش ہوتی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم کسی آتش فشاں میں سفر کر رہے ہیں۔

روشنی نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی اور مجھے مشکل ہی سے کچھ نظر آ رہا تھا۔ بادلوں کی گھن گرج اتنی تیز تھی کہ کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ مستول ایک طرف کو جھکا جا رہا تھا میں اسے پکڑ کر لٹک گیا تاکہ وہ گرنے نہ پائے۔

23 اگست، اتوار

اس وقت ہم کہاں تھے؟ سمندر کی لہریں ہمیں یہاں

انتہائی تیز رفتاری سے لائی تھیں۔ پچھلی رات جو بھیانک طوفان آیا تھا وہ اب تک جاری تھا۔ ہمارے کانوں سے خون بہہ رہا تھا اور آپس میں بات کرنا ممکن نہ تھا۔

بجلی چمک رہی تھی اور بادل اب بھی گرج رہے تھے۔

ہم کہاں جا رہے تھے؟ یہ سوال مجھے رہ رہ کر پریشان کر رہا تھا۔ چچا جان ایک طرف ہاتھ پاؤں پھیلائے پڑے ہوئے تھے۔ گرمی کی شدت میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

24 اگست، پیر

کیا طوفان کا یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا؟ میرے چچا اور میں تھک کر چور چور ہو گئے تھے۔ مگر ہانس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اور وہ پہلے کی طرح سیدھا کھڑا تھا۔ بیڑا اب بھی جنوب مشرق کی طرف سفر کر رہا تھا۔ اندازے کے مطابق ہم جزیرہ البرٹ سے پانچ سو میل کے فاصلے پر آ چکے تھے۔

آدھا دن گزرنے کے بعد طوفان کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ اس اندیشے سے کہ کہیں ہم لڑھک کر سمندر میں نہ جا پڑیں ہمیں خود کو عرشے سے باندھنا پڑا۔ لہریں اس وقت ہمارے سروں پر سے گزر رہی تھیں۔

تین دن تک ہم آپس میں ایک بات بھی نہ کر سکے۔ میرا خیال تھا کہ چچا جان کہیں گے ”ہم ختم ہو چکے ہیں۔“

آتشی گیند

اچانک ہمارے بیڑے پر آگ کا ایک گولا نمودار ہوا۔ مستول اور پھر بیڑے کی تمام چیزیں اس کے شعلوں میں اس طرح غائب ہونے لگیں جیسے ان کا وجود ہی نہیں تھا۔ وہ شعلہ آدھا نیلا اور آدھا سفید تھا جو عرشے پر پڑی ہوئی ہر ایک چیز کی طرف لپک رہا تھا۔ وہ ہانس کے نزدیک گیا، مگر ہانس خوف زدہ نہیں ہوا اور اسے گھور کر رہ گیا۔ پھر وہ میرے چچا کی طرف لپکا، میں اس کی شدت سے کپکپانے لگا۔ شعلہ میرے ایک

پاؤں کے چاروں طرف چکرانے لگا، مگر میں اپنا پاؤں اس جگہ سے نہ اٹھا سکا۔

فضا میں گیس کی ناگوار سی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ میں اپنا پاؤں اس جگہ سے کیوں نہیں ہٹا پا رہا تھا؟ کیا وہ عرشے سے چپک گیا تھا؟ میں نے محسوس کیا کہ شعلوں کی اس گیند نے عرشے پر پڑی ہوئی تمام چیزوں میں مقناطیسی خصوصیت پیدا کر دی ہے۔ ہماری تمام بندوقیں اور اوزار اِدھر اُدھر دوڑتے اور ایک دوسرے سے ٹکراتے پھر رہے تھے۔ میرے جوتے میں لگی ہوئی کیلیں عرشے میں پیوست ایک فولادی پلیٹ سے چپک گئی تھیں۔

اس وقت جب کہ وہ شعلے مجھے جلا کر خاک کر دینے والے تھے میں نے طاقت لگا کر اپنا پاؤں عرشے سے کھینچ لیا۔ اچانک شعلوں کی گیند پھٹ گئی اور چاروں طرف آگ ہی آگ پھیل گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ شعلے ہمیں ہڑپ کرنے کے لیے بے تاب ہوں۔

پھر وہ شعلے بجھ گئے اور اچانک تاریکی چھا گئی۔ آخری لمحوں میں میں نے دیکھا کہ چچا جان عرشے پر لیٹے ہوئے ہیں اور ہانس اب بھی بیڑے کو چلا رہا ہے۔

25 اگست، منگل

میں تھوڑی دیر پہلے ہوش میں آیا تھا۔ ہم اب بھی طوفان میں گھرے ہوئے تھے۔ آسمان پر پہلے کی طرح بجلی کڑک رہی تھی اور پانچ شاخہ آسمان سے زمین کی طرف کوندر ہے تھے۔ ہم سمندر ہی میں تھے اور بیڑا انتہائی تیز رفتاری سے چل رہا تھا۔ ہم انگلستان کے نیچے سے، رودبار کے نیچے سے، فرانس کے نیچے سے اور غالباً سارے یورپ کے نیچے سے گزر رہے تھے۔

پھر ایک نئی آواز سنائی دی۔ یہ یقیناً ایسی آواز تھی جیسے سمندر چٹانوں کو توڑتا ہوا کہیں سے گزر رہا ہو۔

بچ نکلے

یہاں میری ڈائری ختم ہوتی ہے۔

میں یہ نہیں بتا سکتا کہ اس وقت کیا ہوا جب سمندر کی لہروں نے ہمیں چٹانوں کی طرف اُچھال دیا۔ میں اس وقت

بیڑے سے سمندر میں گرنے والا تھا کہ ہانس کے مضبوط اور طاقتور ہاتھوں نے مجھے تھام لیا۔ آئس لینڈ کا وہ بہادر مجھے ساحل تک لے گیا اور جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو اپنے چچا کے پہلو میں پڑے پایا۔ پھر وہ چٹانوں کی طرف گیا اور بیڑے پر سے جو کچھ بچا کر لاسکتا تھا لے آیا۔

میں اس قدر تھکا ہوا تھا کہ ایک گھنٹے تک میرے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل سکی۔ ہانس نے تھوڑا سا کھانا تیار کیا، مگر میں کمزوری کی وجہ سے اسے ہاتھ تک نہ لگا سکا اور شدید تکلیف کے عالم میں سو گیا۔

دوسری صبح موسم خوش گوار تھا۔ پروفیسر کی چہکتی ہوئی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔

''آہا میرے بچے، تمھیں ٹھیک سے نیند آئی؟''

مجھے یہ خیال آیا کہ شاید میں کنگس اسٹریٹ والے مکان میں ہوں اور جولی سے شادی والے دن ناشتہ کرنے اوپری منزل سے نیچے آرہا ہوں۔

مگر نہیں، بیڑا شاید جرمنی کے نیچے سے گزر چکا تھا، میرے شہر ہمبرگ کے نیچے سے، اس سڑک کے نیچے سے جہاں جولی رہتی ہے۔ ہم ایک دوسرے سے تقریباً سو میل کے فاصلے پر تھے، مگر یہ سو میل عمودی تھے اور ہمارے بیچ میں گرینائٹ کی ٹھوس چٹانیں تھیں۔

''تم یہ نہیں بتاؤ گے کہ تمھیں کیسے نیند آئی؟'' چچا جان نے پوچھا۔

''میں اب بھی تھکا ہوا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''مگر آپ بہت ہشاش بشاش ہیں چچا جان۔''

''میں خوش ہوں میرے بچے، بہت خوش، اس لیے کہ بالآخر ہم پہنچ گئے۔''

''اپنا سفر ختم کر کے اپنی منزل پر پہنچ گئے؟''

''نہیں۔ اس سمندر کے اختتام پر پہنچ گئے جو کبھی ختم نہ ہونے والا محسوس ہو رہا تھا۔ اب ہم دوبارہ خشکی پر سفر کر سکتے اور حقیقت میں نیچے جا سکتے ہیں۔''

''چچا کیا میں ایک سوال کر سکتا ہوں؟''

''ہاں البرٹ تم کر سکتے ہو۔''

''ہماری واپسی کیسے ہوگی؟''

''بہت آسانی سے۔ ہم کوئی نیا راستہ تلاش کر لیں گے یا پھر جس راستے سے آئے تھے اس سے واپس چلے جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ وہ بند نہیں ہو جائے گا۔''

''ایسی صورت میں ہمیں بیڑے کی مرمت کرنا پڑے گی۔''

''یقیناً۔''

''مگر ہمارے پاس کیا اتنی خوراک ہے کہ ہم یہ سفر کر سکیں؟''

''ہانس بہت ہوشیار ہے۔ مجھے یقین ہے اس نے کافی خوراک بچالی ہوگی۔ آؤ چلو دیکھتے ہیں۔''

میرا خیال تھا کہ بیڑے کی ہر ایک چیز تباہ ہو چکی ہوگی مگر میں غلط سوچ رہا تھا۔ ہانس ساحل پر ملا، اس کے گرد سب چیزیں نہایت سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ میرے چچا نے احسان مندی سے ہاتھ ملائے۔ اس وقت جب کہ ہاتھ پاؤں پھیلائے ساحل پر پڑے ہوئے تھے ہانس اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے سامان بچا رہا تھا۔ ہماری بندوقیں گم ہو چکی تھیں، مگر باقی سب چیزیں بچ گئی تھیں جن میں اوزار اور بارود تک شامل تھے۔

''یہ رہا مونومیٹر۔'' چچا نے کہا ''سب سے کارآمد اوزار،

ہم اس کے ذریعے سے معلوم کرلیں گے کہ ہم مرکز تک کب پہنچے۔اس کے بغیر ممکن ہے،ہم آگے نکل جائیں۔''

ان کی خوشی میں اندیشے اور وسوسے شامل ہورہے تھے۔

''مگر قطب نما کہاں ہے؟''میں نے پوچھا۔

''یہاں اس چٹان پر رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کرونومیٹر اور تھومومیٹر بھی ہے۔ ہانس نے بہت شاندار کام کردکھایا ہے کہ انھیں بچالیا۔''

''اور خوراک۔''

''آؤ دیکھتے ہیں۔''پروفیسر نے کہا۔

وہ ڈبے جن میں ہماری خوراک تھی،ایک قطار میں رکھے تھے۔بسکٹ،نمک لگا گوشت،خشک مچھلی سب ہی کچھ تھا اور یہ سب اتنا تھا کہ ہم چار مہینے تک کھا سکتے تھے۔

''چار مہینے!''چچا خوشی سے چلائے۔''اتنے عرصے میں تو ہم مرکز تک پہنچ کر واپس آسکتے ہیں اور جو کچھ اس میں سے بچے گا اس سے میں جوہانائم کے پروفیسروں کو ڈنر کی دعوت دوں گا۔''

چچا کی باتیں مجھے حیران کررہی تھیں۔

انھوں نے کہا''ہمیں ان چٹانوں کے درمیان سے بارش کا وہ پانی جمع کرلینا چاہیے جو طوفان نے یہاں چھوڑا ہے۔ پھر میں ہانس سے کہوں گا کہ وہ بیڑے کی مرمت کردے، حالانکہ میرا خیال ہے کہ اس کی دوبارہ ضرورت نہیں پڑے گی۔

''کیوں نہیں پڑے گی؟''میں چیخا۔

''بس ایک خیال ہے میرے بچے کہ ہم اس راستے سے واپس نہیں جائیں گے جس سے کہ آئے ہیں۔''

انھیں اپنی بات کا یقین نہیں تھا پھر وہ درست کیسے ہوسکتے تھے!

''آؤ چلو چل کر ناشتہ کریں۔''وہ بولے۔

جب وہ ہانس کو ہدایات دے چکے تو میں ان کے پیچھے چلنے لگا۔کھانے کے دوران مجھے خیال آیا کہ اتنے مزے دار کھانا میں نے کبھی نہیں کھایا۔میں نے پوچھا کہ ہم اس وقت کہاں ہیں؟

''قطعی طور پر ٹھیک ٹھاک بتانا دشوار ہے۔''انھوں نے جواب دیا۔''اس لیے کہ پچھلے تین دن کا ریکارڈ میرے پاس

نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں حساب لگا سکتا ہوں۔''

''وہ جزیرہ جہاں کہ فوارہ.....''

''جزیرہ البرٹ میرے بچے، وہ زیر زمین پہلا جزیرہ ہے جسے ہم نے دریافت کیا۔''

''ٹھیک ہے جزیرہ البرٹ تک ہم بحیرہ بروک سے چھ سو پچھتر میل کا سفر کر چکے تھے اور آئس لینڈ سے ڈیڑھ ہزار میل کے فاصلے پر تھے۔''

''ٹھیک ہے۔ اس مقام سے حساب لگانا شروع کرتے ہیں۔ چار دن ہم نے طوفان میں گزارے اور اس دوران ہم نے ہر چوبیس گھنٹوں میں تقریباً دو سو میل کا فاصلہ طے کر لیا ہوگا۔''

اس طرح آٹھ سو میل مزید جوڑ لینا چاہئیں۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ بحیرہ بروک ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ڈیڑھ ہزار میل ہے۔ اس کو یوں سمجھ لو کہ یہ بحرِ روم کے برابر ہے۔''

''گویا ہم نے اس کی چوڑائی پار کی ہے۔''

''ہاں۔ یہ ممکن ہے۔''

''اس کے علاوہ اگر ہمارا حساب درست ہے تو بحرِ روم اس وقت ہمارے سروں پر ہے۔''

''واقعی؟''

''ہاں۔ اس لیے کہ ہم رکیاوک سے بائیس سو پچاس میل کے فاصلے پر ہیں۔''

''ہم نے بہت لمبا راستہ طے کر لیا ہے، میرے بچے، مگر ہم یہ یقین سے اس وقت تک نہیں کہہ سکتے کہ ہم بحرِ روم کے نیچے ہیں جب تک ہمیں یہ یقین نہ ہو جائے کہ طوفان کے دوران ہماری سمت تبدیل نہیں ہوئی ہے۔''

''مجھے یقین ہے کہ سمت تبدیل نہیں ہوئی ہے، اس لیے کہ ہوا نے اپنا رخ تبدیل نہیں کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ کنارہ پورٹ جولی کے جنوب مشرق میں ہے۔''

''ہوں۔ ہم قطب نما دیکھ کر اس کا پتا چلا سکتے ہیں۔''

پروفیسر اس چٹان کی طرف چلنے لگے جہاں ہانس نے سب اوزاروں کو قرینے سے جھاڑ پونچھ کر رکھا تھا۔ اس وقت ان کا چہرہ نوجوانوں کی طرح سے چمک رہا تھا۔ اس چٹان کے قریب پہنچ کر انھوں نے قطب نما اٹھایا اور اس کی سوئی کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر انھوں نے اپنی آنکھیں ملیں اور دوبارہ دیکھا۔ اس کے بعد وہ حیرت سے میری طرف مڑے۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں قطب نما کی طرف دیکھوں۔ میں نے ان کے ہاتھ سے اسے لے لیا۔ قطب نما کی سوئی کی نوک جنوب کی طرف اشارہ کر رہی تھی! اور وہ سمندر کی طرف اشارہ کرنے کے بجائے زمین کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

میں نے قطب نما کو ہلایا جلایا اور ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل صحیح کام کر رہا تھا مگر میں جہاں بھی اسے لے جاتا تھا سوئی غیر متوقع طور پر اس سمت کی طرف اشارہ کرنے لگتی۔ طوفان کے دوران ہوا نے لازماً اپنا رخ تبدیل کیا تھا اور بیڑے کو اسی کنارے پر لا کر ڈال دیا تھا جہاں سے کہ ہم چلے تھے۔

■

(جاری)

ماخذ: زمین کی تہہ میں (جولز ورنے کے ناول کا ترجمہ)، مترجم: شکیل صدیقی، ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، اشتراک: قومی کونسل

■ شیخ محمد یسعٰ آصف اقبال

کتاب میلہ

کہتے ہیں کہ ''انسان کا سچا ساتھی کتاب ہے۔'' اسی بات کی بنا پر ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام نے کہا ''ایک اچھی کتاب ایک اچھے دوست کے برابر ہے، اور ایک اچھا دوست ایک لائبریری کے برابر ہے۔'' کتابیں کئی طرح کی ہوتی ہیں جیسے معلوماتی، شاعری کی، کتابت کی، سیاسی، سماجی، وغیرہ اگر یہ سب کتابیں ایک ہی جگہ مل جائیں تو کیا کہنے! اور وہ جگہ ہے ''یہ کتاب میلہ''

ہمارے شہر سولاپور میں 23 دسمبر تا 31 دسمبر اکیسواں کل ہند عظیم الشان اردو کتاب میلہ لگا تھا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے زیر اہتمام اور بزم غالب سولاپور کے اشتراک سے یہ کتاب میلہ منعقد کیا گیا تھا۔ کتاب میلے کی خبر سن کر میرا دل باغ باغ ہوگیا کہ کتاب میلہ ہمارے شہر میں لگا ہے۔

کتاب میلے کا مقررہ وقت صبح 11 بجے سے شام 8 بجے تک تھا۔ وہاں کتابوں پر خصوصی رعایات تھیں۔ ہر روز ثقافتی پروگرام ہوتے تھے۔ میں ہر روز میلے میں جاتا اور کتابیں خریدتا۔ میں نے کل 14 ہزار روپے تک کی کتابیں خریدیں۔ وہاں کئی مختلف، قسم کی کتابیں تھیں جیسے درس حیات Arabian Night عرف الف لیلہ، آداب سخن، دیوانِ غالب، کلیات اقبال، شاعری کا وزن اور کئی دیگر۔

میں نے کتاب میلے میں کئی کتابیں خریدیں۔ میرے کمرے کی الماریاں بھر گئی ہیں۔ میں ساری کتابیں پڑھوں گا اور اپنے علم میں اضافہ کروں گا۔

■

Shaikh Mohd Yasa Asif Iqbal
Class: VII, Solapur, Maharashtra

جرار احمد

اچھے ماحول کی برکتیں

پیارے بچو! آج ہم آپ کو اچھے ماحول کی برکتوں میں سے ایک بڑی اچھی اور پیاری برکت کے بارے میں بتائیں گے۔

ایک شہر میں ایک ایسا گھر تھا جو کل چھ 6 افراد پر مشتمل تھا، جو نہ بہت غریب اور نہ بہت امیر بلکہ اس گھر کے لوگ بیچ کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس گھر کے سربراہ اکثر بیمار رہا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک کا اچانک کسی بیماری کی وجہ سے انتقال ہوگیا۔ شاید اللہ کی یہی مرضی تھی، کیوں کہ گھر والوں نے علاج میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی۔ اب ان کی اہلیہ اکیلی ہوگئی تھیں اور وہ بھی بیمار رہا کرتی تھیں، ان کے علاج کے لیے بھی گھر والوں نے سب کچھ کیا، دوا، دعا، مگر بیماری تھی کہ جانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ گھر والے علاج سے صرف اس لیے مطمئن تھے کہ ان کی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں برتی جا رہی ہے اور ان کو اس بات کا فخر بھی تھا کہ ہم نے علاج میں کوئی کمی نہیں کی۔ بس پریشانی اسی بات کی تھی کہ مرض کی تشخیص نہیں ہو پا رہی تھی۔ کوئی ڈاکٹر کچھ کہتا تو کوئی کچھ اور سب اپنے اپنے حساب سے اندھیرے اور اجالے میں اپنی دواؤں کے تیر چلا دیتے تھے۔

بالآخر عاجز آ کر ایک دن اس گھر کے لوگ ایک بزرگ حکیم کے پاس گئے اور تمام تفصیلات دست بستہ ان کو سنا کر پوچھا آخر کون سی بیماری ہے کہ پتہ نہیں چل پا رہا ہے اور کوئی بھی دوا کام نہیں کرتی ہے؟ وہ بزرگ مسکرائے اور بولے دوا تو کسی حد تک سب ٹھیک ہی چل رہی ہے مگر بیماری ہر وقت ان کے ساتھ رہتی ہے۔ دوا تین وقت کھاتی ہیں مگر بیماری ہر وقت ان کو ڈنک مار رہی ہوتی ہے۔ اتنا کہہ کر وہ بزرگ حکیم خاموش ہوگئے۔ بڑی منت سماجت کے بعد بزرگ نے بتایا کہ بیماری تم لوگ خود ہو جو ہمیشہ ان کے ساتھ رہتے ہو۔ کہنے کو تو تم لوگ ان کی آل اولاد ہو مگر درحقیقت مرض بن کر اپنے جراثیم ہر وقت ان پر چھڑکتے رہتے ہو۔ اتنا سننا تھا کہ وہ لوگ آگ بگولہ ہوگئے اور بولے کہ کیا بات کرتے ہیں۔ آپ کو شاید پتہ نہیں کہ ان کے علاج میں ہم نے کوئی کسر نہیں چھوڑی اور اس بات کے گواہ ہمارے شہر کے لوگ بھی ہیں۔ آپ ہیں کہ نہ جانے کیا کیا بک رہے ہیں اور سراسر الزام ہمیں کو دے رہے ہیں۔ بزرگ حکیم مسکراتے ہوئے بولے، یہی غصہ جو تم ابھی مجھ پر دکھا رہے ہو ان کی بیماری کی اصل وجہ ہے۔ کیا صرف دوا کر دینا ہی کافی ہے؟ کیا صرف دوا سے ہی علاج ہوتا ہے؟ کیا یہی والدین کی خدمت ہے؟ ہرگز نہیں۔! کتنی بیماریاں تو صرف خوش مزاجی اور اچھے ماحول سے ختم ہو جاتی ہیں۔ کیا تم لوگوں نے کبھی ان کو خوشگوار ماحول فراہم کیا؟ حکیم کے اس سوال پر سب لوگ خاموش ہوگئے۔ پھر حکیم نے ان سے سوال کیا کہ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم میں ہر کوئی کسی نہ کسی دن اس بات پر ناراض ہو جاتا ہے کہ آج اس کے من پسند کا کھانا نہیں پکا؟ یا پھر کھانے میں نمک یا مرچ زیادہ ہوگئی؟ کیا یہ جھوٹ ہے کہ گھر میں تم لوگ ایک دوسرے پر چھوٹی چھوٹی بات کے لیے ناراض ہو جاتے ہو؟ سب پر سکتے کا عالم طاری تھا۔ حکیم صاحب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ تم سوچتے ہو کہ تم اپنا یہ غصہ تو کھانا بنانے والے پر یا کسی اور پر دکھا رہے ہو مگر یاد رکھو

والدین پر وہ بھی جب وہ عمر رسیدہ ہو جاتے ہیں تو بہت ہی گہرا اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ کوئی دوا کھاتے ہیں تو اثر نہیں کرتی ہے کیوں کہ تم لوگ ایک دوسرا بکھیڑا کھڑا کر دیتے ہو۔ یاد رکھو صرف اچھے سے اچھا علاج کرا دینا کافی نہیں۔ اگر کچھ کرنا چاہ رہے ہو تو دوا کے ساتھ ان کو اچھا اور خوشگوار ماحول بھی فراہم کرو۔ ان کی خوشی کے لیے بلکہ ان کے علاج کا ایک حصہ سمجھ کر ان پر کبھی بھی غصہ کیا 'اُف' تک نہ کہو اور نہ ہی ان کے سامنے کسی پر غصہ کرو۔ جہاں تک ہو سکے ان کے سامنے ہمیشہ ہنستے مسکراتے رہو، خود خوش رہو گے تو وہ بھی خوش رہیں گے اور اس کے بعد علاج کرو گے تو وہ بھی فائدہ مند ہوگا۔ بزرگ کی ان باتوں سے وہ لوگ بہت متاثر ہوئے اور اپنے عمل پر پچھتائے اور کہا کہ اگر آج آپ نے ہماری آنکھیں نہیں کھولی ہوتیں تو زندگی بھر ہم اسی خوش فہمی میں رہتے اور فخر کرتے کہ ہم نے اچھے سے اچھا علاج کیا اور کوئی کوتاہی نہیں کی، مگر آپ نے ہماری آنکھیں کھول دیں۔ ہم عہد کرتے ہیں کہ آپ کی بتائی ہوئی تمام باتوں پر عمل کریں گے اور دوا کے ساتھ ساتھ خوشگوار ماحول بھی فراہم کریں گے۔

تو پیارے بچو! آپ بھی وعدہ کریں کہ اپنے امی ابو کی باتوں سے ناراض ہو کر کبھی کوئی غلط کام نہیں کریں گے اور نہ ہی ان پر ناراض ہوں گے اور نہ ہی ان کے سامنے کسی اور پر ناراضگی کا اظہار کریں گے بلکہ آپ بھی اپنے گھر کا ماحول خوشگوار بنائیں گے۔ یقیناً یہ ایک بہت بڑی اور ایسی نعمت ہے جس کی بے پناہ برکتیں ہیں۔

■

Jarrar Ahmad
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad, Telangana

■ جاوید اقبال

پہیلیاں

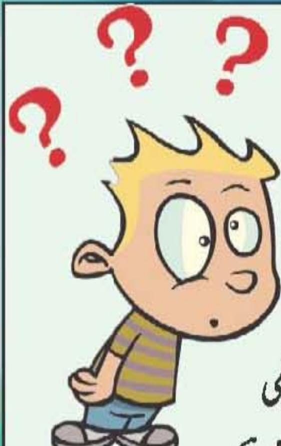

(1) گول گول گولی تھی
ہاتھوں میں کھیلتی تھی
آگ میں سکتی تھی
سب کا پیٹ بھرتی تھی

(2) ٹھنڈا ٹھنڈا ایک کمرہ ہے
دودھ ملائی کا پنجرہ ہے
سب کے دل کو بھاتا ہے
پر کوئی نہ اس میں رہتا ہے

(3) تین پنکھ کی ایک چڑیا ہے
پیٹ اس کا گول گیا ہے
ایک ٹانگ سے وہ لٹکی ہے
پھر بھی چاروں اور اڑتی ہے

(4) رات دن ہر پل چلتی ہے
گز بھر نہ کہہ سکتی ہے
ریل ہو کہ جہاز ہو
سب کو اپنے تابع رکھتی ہے

(5) مرغ جب بانگ دیتا ہے
اور موذن اذان دیتا ہے
کلیاں جب چٹکتی ہیں
اور پھول کھل کر ہنستے ہیں
تم بتاؤ اے بچو
کون اندھیروں کو بھگاتا ہے؟

■ جوابات اسی شمارے میں تلاش کریں

■

Javed Iqbal
D 82, Surudey Nagar
Lucknow (UP)

ایم یوسف انصاری

لومڑی اور جنگلی بطخ

ایک دن لومڑی شکار کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی تھی۔ آخرکار اسے ایک شکار نظر ہی آگیا۔ ایک جنگلی بطخ درخت پر بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر لومڑی کے منہ میں پانی بھر آیا۔ مسکین صورت بنا کر، درخت کے قریب گئی اور بولی "کہو بیٹی کیسی ہو؟ بہت دنوں بعد نظر آئی ہو۔ اتنے دنوں سے کہاں گئی تھیں؟"

جنگلی بطخ: قیں قیں! آداب خالہ جان۔ برسوں بعد آپ کا دیدار نصیب ہوا۔ مزاج کیسے ہیں! گزر بسر کس طرح ہو رہی ہے؟

لومڑی: تمھاری دعا سے ٹھیک ہوں۔ ابھی ابھی شہر سے آ رہی ہوں۔

جنگلی بطخ: قیں قیں! تو کیا ہوا؟

لومڑی: شہر سے نیا قانون لے کر آئی ہوں۔ اب تو تمھارے مزے ہی مزے ہیں۔

جنگلی بطخ: قیں قیں! ذرا میں بھی تو سنوں۔ وہ قانون کیا ہے؟

لومڑی: اس قانون کے تحت تمام بطخیں اور پرندے اب زمین پر بھی چل پھر سکتے ہیں۔ چاروں طرف امن و امان ہوگا۔ شیر بکری ایک گھاٹ پر پانی پئیں گے۔

جنگلی بطخ: قیں قیں! آپ نے تو خوش خبری سنائی۔ اب ہم بھی سبزہ زاروں پر چہل قدمی کر سکیں گے۔ مخمل

شاکر حسین شبیر حسین

سرسید احمد خاں

(1) سرسید احمد خان 17 اکتوبر 1817 کو دہلی میں پیدا ہوئے۔
(2) سرسید احمد خان کے دادا کا نام سید ہادی تھا؟
(3) سرسید احمد خان کے والد کا نام سید متقی تھا؟
(4) جس خادمہ نے سرسید احمد خان کو پالا اس کا نام مان بی بی تھا۔
(5) سرسید احمد خان کے نانا کا نام خواجہ فرید الدین تھا۔
(6) سرسید احمد خان کی رسم بسم اللہ شاہ غلام علی کے ہاتھوں ہوئی۔
(7) سرسید احمد خان نے قرآن پردہ نشین خاتون سے پڑھا۔

■

Shakir Husain Shabbir Husain
Firdaus Colony (Maharashtra)

سید مرتشیٰ سید خالق

سائنسی معلومات

* خون کے لال ذرات R.B.c 120 دنوں تک محفوظ رہ سکتے ہیں۔
* ربر گرم کرنے سے سکڑ جاتا ہے۔
* یورنیم، پلاٹینم، تھیوریم اور ریڈیم دھاتیں سونے سے بھی زیادہ قیمتی ہیں۔
* برف جمانے میں امونیا گیس کا استعمال ہوتا ہے۔
* پلاٹینم دھات پر تیزاب اثر نہیں کرتا۔
* نظام شمسی کے سیاروں میں سب سے ٹھنڈا سیارہ پلوٹو ہے۔
* جگنو کی روشنی بغیر حرارت کے پیدا ہوتی ہے۔
* سب سے پہلے سورج جاپان میں طلوع ہوتا ہے۔ ■

Syed Murtasha Syed Khaliq
Al-Hasnat Urdu High School
Rasulpur, Raveer
Distt: Jalgaon - 425508 (Maharashtra)

جیسے فرش پر چلنے میں کتنا مزہ آئے گا۔

لومڑی: ہاں پیاری بیٹی! اب جلدی سے نیچے اترو۔ قانون کا فائدہ اٹھاؤ۔ نرم گھاس پر چہل قدمی کے مزے لوٹو۔ اب تمھیں کوئی چھو بھی نہیں سکتا۔

جنگلی بطخ: قیں قیں! بہت اچھا خالہ جان! ابھی آتی ہوں۔ مگر ذرا اس شخص کو گزر جانے دو۔

لومڑی: وہ کون ذات شریف ہیں، بیٹی؟

جنگلی بطخ: ارے وہ تو بے چارہ کسان ہے، بڑا رحم دل ہے۔

لومڑی: اچھا— مگر اس کے پیچھے یہ کون آیا ہے؟

جنگلی بطخ: قیں قیں! ارے وہ تو اس کا پالتو بچھڑا ہے مگر ہے بہت رحم دل۔

لومڑی: اس کے سینگ اور دم کیسی ہے؟

جنگلی بطخ: سینگ تو نوکدار اور مضبوط ہیں۔ دُم تو ملائم بالوں کی ہے مگر اس کی مار کوڑے جیسی ہے۔

لومڑی: اچھا بیٹی! خدا حافظ۔

جنگلی بطخ: جی خالہ جان سے ملتی تو جاؤ۔

لومڑی: نہیں بیٹی۔ دور سے سلام۔ مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا۔ اچھا تو میں چلتی ہوں۔

جنگلی بطخ: مگر خالہ جان! تمھاری روزی کا کیا ہوگا؟

لومڑی: روٹی مل گئی تو روزی ورنہ روزہ۔

اتنا کہہ کر لومڑی رفو چکر ہو گئی۔

■

M. Yusuf Ansari
368, New Ward
Malegaon - 423203 (Nasik)

چمن چمن کے پھول

انیس آساں نہیں آباد کرنا گھر محبت کا
یہ اُن کا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں
(میرانیس)

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے
اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے
تدبیر سے قسمت کی برائی نہیں جاتی
بگڑی ہوئی تقدیر بنائی نہیں جاتی
(داغ دہلوی)

چت بھی اپنی ہے پٹ بھی ہے اپنی
میں کہاں ہار ماننے والا
(یگانہ چنگیزی)

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا
مجھے سرمار کر تیشے سے مرجانا نہیں آتا
(یگانہ چنگیزی)

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
بھلا منظور ہو اپنا تو خدمت کر فقیروں کی
قضا کو روک دیتی ہے دعا روشن ضمیروں کی
(شاد عظیم آبادی)

وہ عطر دان سا لہجہ مرے بزرگوں کا
رچی بسی ہوئی اردو زبان کی خوشبو
(بشیربدر)

رات تو وقت کی پابند ہے ڈھل جائے گی
دیکھنا ہے کہ چراغوں کا سفر کتنا ہے
(وسیم بریلوی)

چل کر کبھی ہمارے اندھیرے بھی دیکھیے
ہم لوگ روشنی میں بڑے پروقار ہیں
(تسنیم فاروقی)

امیر زادوں سے دلی کے مت ملا کر میر
کہ ہم غریب ہوئے ہیں انھیں کی دولت سے
(میؔر)

خوشی کے ساتھ دنیا میں ہزاروں غم بھی ہوتے ہیں
جہاں بجتی ہے شہنائی وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں
(نامعلوم)

ارادے باندھتا ہوں، سوچتاں، توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہوجائے کہیں ویسا نہ ہوجائے
آنے والے کسی طوفان کا رونا رو کر
ناخدا نے مجھے ساحل پہ ڈبونا چاہا
(حفیظ جالندھری)

■

آپ کا دماغ کتنا تیز ہے؟

دوستو! یہ دونوں تصویریں دیکھنے میں تو ایک جیسی لگتی ہیں لیکن تصویروں کی نقل بنانے والے سے ایک دو نہیں بلکہ دس غلطیاں ہوگئی ہیں۔ کیا آپ ان غلطیوں کو تلاش کر سکتے ہیں؟ 10 منٹ میں اگر آپ نے تمام غلطیاں تلاش کر لیں تو سمجھیے کہ واقعی آپ کا دماغ بہت تیز ہے۔

جوابات اسی شمارے میں تلاش کریں

ہادیہ نور

سونے کا ہرن

بات اس زمانے کی ہے، جب ہرنوں کی تعداد بہت کم تھی۔ ایک دن کی بات ہے ایک ہرن پانی کی تلاش میں گاؤں میں پہنچ گئی۔ اسے پانی کی پیاس کی وجہ سے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ ایک جگہ پر چمکیلا پیلا رنگ بہت بڑے برتن میں رکھا تھا۔ ہرنی اسے پانی سمجھ کر اس میں کود گئی۔ اب وہ پوری طرح سے سونے کی دکھنے لگی۔ تھوڑی دور چل کر اسے ایک نہر دکھائی دی۔ وہ اس کی طرف بڑھی۔ اس نے پانی میں جھانکا تو وہ حیران رہ گئی۔ اس نے دیکھا کہ وہ تو پوری طرح سونے کی دکھنے لگی۔ وہ پانی پی کر جنگل کی طرف دوڑ پڑی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب سارے جانور میری عزت کریں گے۔ وہ اسی سوچ میں تھی کہ اچانک ایک لکڑہارے کی نظر اس پر پڑی۔ وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ لکڑہارے نے اس پر جال پھینکا۔ ہرنی سوچ میں تھی۔ اس لیے آسانی سے جال میں پھنس گئی۔ لکڑہارا روز جنگل میں لکڑیاں کاٹنے آیا کرتا تھا لیکن اس نے پہلی بار سونے کا ہرن دیکھا تھا۔ وہ جلد ہی ہرن کو اپنے گھر لے گیا اور اسے گھر میں باندھ دیا۔ ہرن پریشان ہوگئی کہ اب وہ کس طرح جنگل واپس جائے؟ تھوڑے دن بعد اس نے یہاں سے بھاگنے کا خیال بھی دل سے نکال دیا کیونکہ لکڑہارا جنگل سے روز لکڑیوں کے ساتھ ساتھ ہرن کے لیے میٹھے میٹھے پھل بھی لاتا تھا۔ ایک دن لکڑہارے نے سوچا کہ مجھے اس ہرنی کو اونچے دام میں بیچ دینا چاہیے۔ لکڑہارے نے کچھ ہی دنوں بعد اسے درزی کو بیچ دیا۔ اب درزی اسے اچھے اچھے کپڑے پہناتا اور اس کے ساتھ ہی اچھے اور مزے دار پھل کھانے کو دیتا تھا۔ کچھ دنوں بعد ہرن نے درزی اور ایک جوتے بنانے والے کو بات کرتے سنا۔ درزی جوتے والے سے کہہ رہا تھا کہ میرے پاس ایک سونے کا ہرن ہے۔ میں اسے بیچنا چاہتا ہوں۔ کیا تم اسے خریدو گے۔ یہ سن کر جوتے والے کی آنکھیں چمک گئیں۔ اس نے اسے خریدنے کے لیے پانچ دن کا وقت مانگا۔ ہرن ان دونوں کی باتیں سن کر بہت اداس ہوگئی کیونکہ درزی اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اچھے اچھے پھل کھلاتا، اچھے کپڑے بھی دیتا تھا۔ ہرن کو مجبوراً جوتے والے کے گھر جانا ہی پڑا۔ ہرن نے جیسا سوچا تھا ویسا بالکل بھی نہیں تھا۔ جوتے والا بہت مالدار تھا۔ اس

کا گھر بہت عالیشان تھا۔ ہرنی وہاں آ کر بہت خوش تھی کیونکہ جوتے والا لکڑ ہارے اور درزی سے بھی زیادہ ہرن کا خیال کرتا تھا۔ ایک دن غلطی سے ہرن نے اپنے آگے کے پیر پانی میں ڈال دیے۔ تبھی اس کے پیروں کا رنگ نکل گیا۔ اب وہ پریشان ہوگئی کہ اب اس کی پول کھل جائے گی۔ اس کے دماغ میں ایک ترکیب آئی۔ اس نے جوتے والے سے کہا ''کیا تم میرے لیے جوتے بنا سکتے ہو۔ جوتے والے نے جلدی ہی اس کے لیے جوتے بنا دیے۔ جوتے دیکھ کر ہرنی بہت خوش ہوئی۔ کچھ دنوں بعد جوتے والے کی بہن اس کے گھر آئی۔ وہ بہت چالاک تھی۔ جوتے والے نے اپنی بہن کو ہرن کے بارے میں بتایا کہ یہ سونے کا ہرن ہے۔ اسے میں نے درزی سے خریدا ہے۔ درزی نے کہا تھا کہ یہ ہرن جس گھر میں جاتا ہے۔ اس گھر کو مالا مال کر دیتا ہے۔ جوتے والے کی بہن سوچنے لگی کہ ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔ یہ ہرنی سونے کی نہیں ہوسکتی پھر اس نے جوتے والے سے پوچھا کہ یہ ہرن جوتے کیوں پہنے ہوئے ہے۔ تب جوتے والے نے اس کو بتایا کہ جوتے بنانے کے لیے اسے ہرن نے ہی کہا تھا۔ اس نے غور کیا کہ نہ ہی ہرنی کبھی نہاتی ہے اور نہ ہی جوتے اتارتی ہے۔ بہن نے اپنے بھائی سے کہا کہ کیوں نہ ہم اسے سرکس میں بیچ دیں لیکن اس سے پہلے ہمیں اسے بتلا دینا چاہیے۔ جوتے والا اس بات پر راضی ہوگیا۔ اس نے مشورے کے لیے لکڑ ہارے اور درزی کو بھی بلایا۔ پہلے انھوں نے اس کے جوتے اتارے۔ ہرنی کو بہت ڈر لگ رہا تھا۔ انھوں نے جیسے ہی اس پر پانی ڈالا ہرنی کا سارا رنگ اتر گیا۔ سبھی کے ہوش اڑ گئے۔ جوتے والے نے بہت غصے سے درزی سے کہا ''یہ تم نے ٹھیک نہیں کیا، تم نے میرے ساتھ دھوکہ کیا۔'' درزی نے کہا ''نہیں، نہیں ساری غلطی اس لکڑ ہارے کی ہے۔ اسی سے میں نے ہرنی خریدی تھی۔'' سبھی لکڑ ہارے کو مارنے کے لیے آگے بڑھے۔ تبھی ہرن نے سبھی کو سارا سچ بتا دیا۔ ہرن کی سچائی سے سب بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے ہرن کو معاف کر دیا اور ہرنی چھلانگیں مارتے ہوئے جنگل کی طرف چلی گئی۔

■

Hadiya Noor Khalid Akhtar
Near Auliya Bidi Factory, Khanka Ward
Burhanpur - 450331 (Madhya Pradesh)

آفرین پروین فیروز خان، درجہ: ہشتم
ضلع پریشد اردو اسکول، نیم گاؤں، ناندورہ، بلڈانہ، مہاراشٹرا

ثانیہ پروین عثمان خان، درجہ: پنجم، ضلع پریشد اردو اسکول، نیم گاؤں، ناندورہ، بلڈانہ، مہاراشٹرا

جنید خان عارف خان، درجہ ہفتم، ضلع پریشد اردو اسکول، نیم گاؤں، ناندورہ، بلڈانہ، مہاراشٹرا

نغمہ پروین صاحب خان، درجہ: پنجم
ضلع پریشد اردو اسکول، نیم گاؤں، ناندورہ، بلڈانہ، مہاراشٹرا

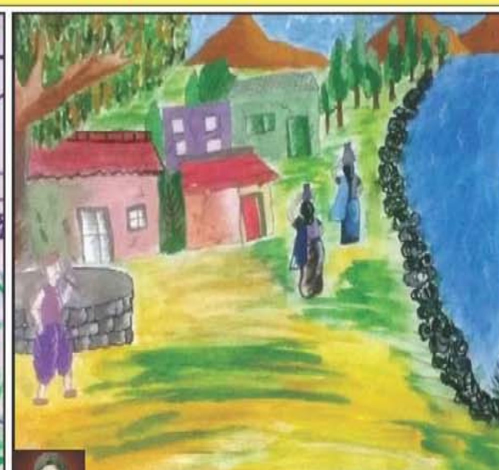

زوبیا عدین سید قادر، درجہ: ہفتم، صفہ انگلش اسکول، اکولہ، مہاراشٹر

مسکان پروین داؤد خان، درجہ: ششم، ضلع پریشد اردو اسکول، نیم گاؤں، ناندورہ، بلڈانہ، مہاراشٹرا

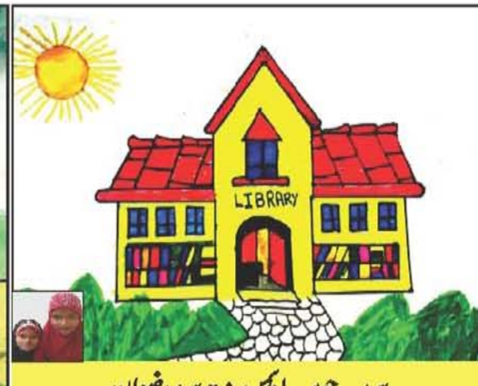

سیدیہ جویریہ ایمن بنت سید رضوان
درجہ: پنجم، ملیہ گرلس پرائمری اسکول بیڑ، مہاراشٹر

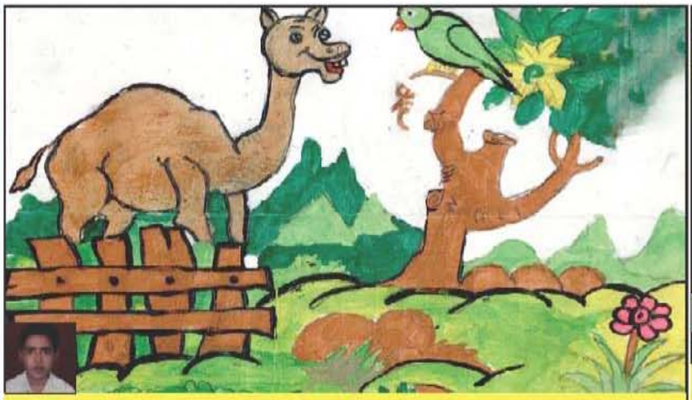

شاداب خان، منگرول، پیرواشم

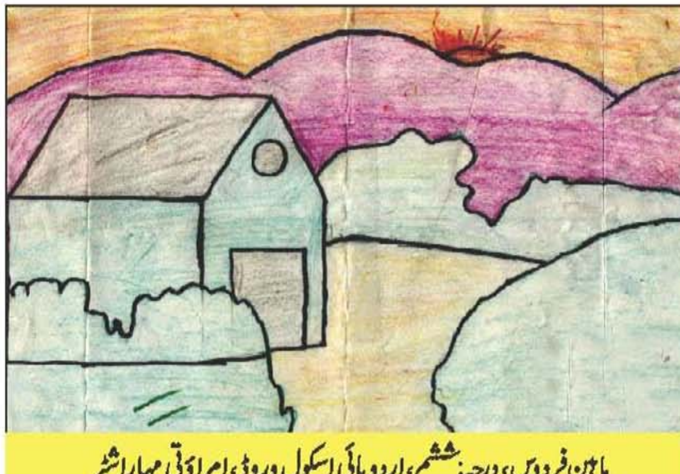

ماہین فردوس، درجہ: ششم، اردو ہائی اسکول وروڈ، امراوتی مہاراشٹر

شانیزہ فاطمہ، درجہ ہشتم
جمنا ویلی، ہائی اسکول، آزادنگر، کریلی، الہ آباد، یوپی

انصاری نمرہ نثار احمد، درجہ: پنجم، شیواجی نگر نندی، روڈ دھولیہ، مہاراشٹر

معین خان کلیم خان، درجہ چہارم، سرسید احمد خان پرائمری اسکول، یاول، ضلع جلگاؤں، مہاراشٹر

اردو فیس بک facebook

میں جماعت دوم کا طالب علم ہوں۔ مجھے 'بچوں کی دنیا' پڑھنا اور اس کے ہر ورق کو دیکھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ اس کے رنگین فوٹو اور آپ کا دماغ کتنا تیز ہے، بہت پسند آیا۔

ایان امجد خان، اقراء اردو پرائمری اسکول، جلگاؤں، پرتاپ نگر، مہاراشٹر

میں بہت بے صبری سے 'بچوں کی دنیا' کا انتظار کرتی ہوں۔ کبھی 'ہارڈ کاپی' دیر سے آتی ہے تو میں نیٹ پر ہی پڑھ لیتی ہوں۔

عمرہ، درجہ نہم، اے ایم یو سٹی گرلس ہائی اسکول، آزاد نگر، آئی ٹی آئی روڈ، علیگڑھ، یوپی

میں درجہ پنجم کا طالب علم ہوں۔ 'بچوں کی دنیا' کا بڑی بے صبری سے ہر مہینے انتظار کرتا ہوں۔ بچوں کی دنیا کا یہ تحفہ مجھے میری امی نے دیا تھا۔ بس تب سے ہی مجھے اس کی ایسی عادت لگ گئی ہے کہ میں جب تک اس کو نہ پڑھ لوں میں بے چین رہتا ہوں۔ بچوں کی دنیا نئے اردو پڑھنے والوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اس کو پڑھنے سے مجھے اردو سے بھی دلچسپی ہوگئی ہے۔

ایمن خان امجد خان، اقراء اردو ہائی اسکول، سالار نگر، جلگاؤں، مہاراشٹر

'بچوں کی دنیا' کو پڑھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ یہ ماہنامہ ترقی کی منزلیں بہت تیزی سے طے کر رہا ہے۔ یہ بات بالکل صاف ہے کہ زبان اردو کے فروغ کے لیے اور اردو کی خدمت کے لیے بہت سے رسالے جاری ہیں۔ لیکن بچوں کی دنیا کو اس کوشش میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔

مسکان بی سید خالق، الحسنات اردو اسکول، رسلپور، تعلقہ راویر، جلگاؤں، مہاراشٹر

میں درجہ نہم میں پڑھتی ہوں اور 'بچوں کی دنیا' تقریباً دو سال سے پڑھ رہی ہوں۔ ستمبر 2017 کے شمارے میں دوستی، استاد (نظم)، اور ایک دکھ بھری کہانی، ماں، کہانیاں، بہت پسند آئیں۔

سمیرہ بیگم مجیب خان، فاطمہ گرلس ہائی اردو اسکول، بیگم پورہ، مہاراشٹر

'بچوں کی دنیا' میں میرا مضمون ماہ اپریل میں کتاب کا پیغام شائع ہوا تھا جس کی وجہ سے تمام اساتذہ نے میرا استقبال کیا اور ہمت افزائی کی۔ 'بچوں کی دنیا' میں ننھے فنکار بہت اچھا کالم ہے۔ بچوں کی دنیا سچ میں ایک قابل تعریف رسالہ ہے۔

سیدہ اریبہ نایاب سید منیر الدین، فاطمہ گرلس اردو ہائی اسکول، بیگم پورہ، مہاراشٹر

'بچوں کی دنیا' ڈھیر ساری معلومات، قصہ کہانیوں کا بھرپور ذخیرہ لیے ہوئے آتا ہے۔ مجھے بہت ہی پسند ہے۔ ہر ماہ شمارے کا انتظار رہتا ہے۔ گھر کا ماحول، تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے گھر میں توجہ سے پڑھا جاتا ہے۔ میں تین سال سے اس کا خریدار ہوں۔ تازہ شمارے کی نظمیں اور کہانیاں بہت پسند آئیں۔

محمد ایاز محمد فاروقی، درجہ ششم، اردو اسکول، برکھنڈی، تعلقہ پاچورا، جلگاؤں، مہاراشٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

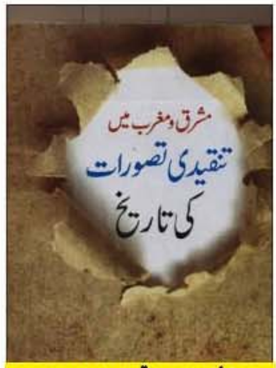

صفحات:373، قیمت:168 روپے

صفحات:131، قیمت:85 روپے

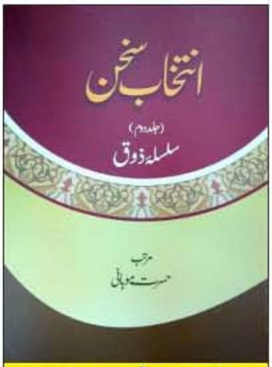

صفحات:321، قیمت: 55 روپے

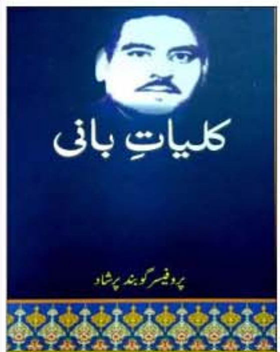

صفحات:383، قیمت:180 روپے

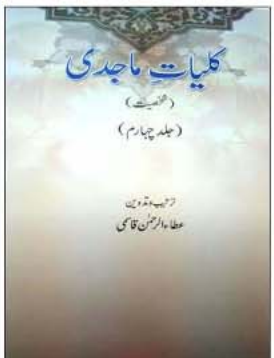

صفحات: 527، قیمت: 230 روپے

صفحات:129، قیمت:85 روپے

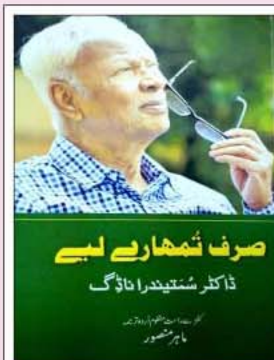

صفحات:139، قیمت: 85 روپے

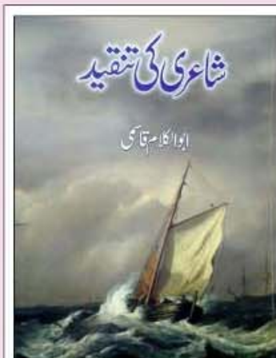

صفحات: 327، قیمت: 155 روپے

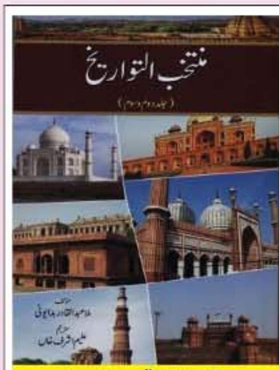

صفحات:215، قیمت:75 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746 فیکس:011-26108159 sales@ncpul.in, E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com

BACHON KI DUNIYA Monthly, April 2018, Vol. 06, Issue: 04
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439-2016-18
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/03/18
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دل چسپ کتابیں

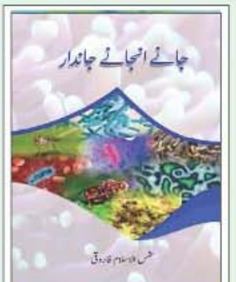

صفحات:66 ، قیمت:35 روپے

صفحات: 32 ، قیمت: 20 روپے

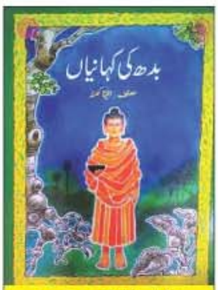

صفحات: 80 ، قیمت: 65 روپے

صفحات:80 ، قیمت:35 روپے

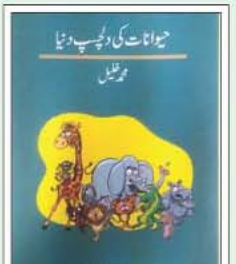

صفحات:83 ، قیمت:24 روپے

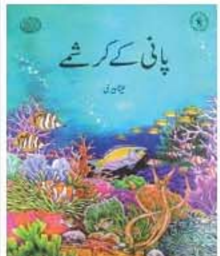

صفحات:96 ، قیمت:70 روپے

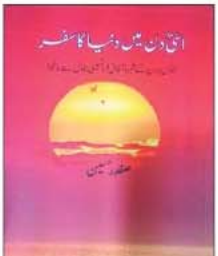

صفحات:170 ، قیمت:35 روپے

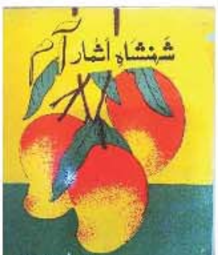

صفحات:64 ، قیمت:11 روپے

خریداری کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.